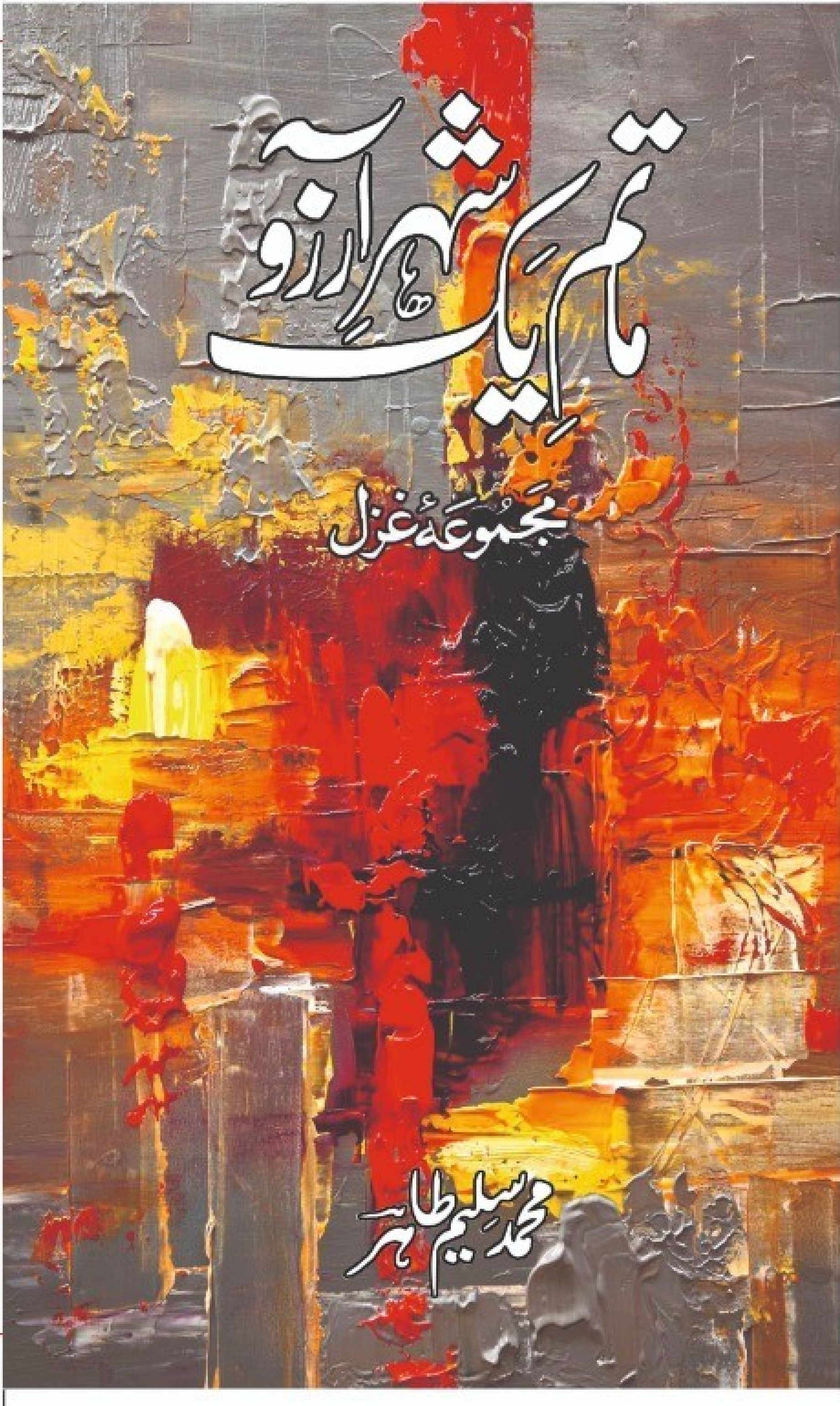

محمد سلیم طاہر کی شخصیت کے کئی رُخ ہیں۔ ٹی وی پروڈیوسر کی حیثیت سے وہ اپنی محنت کے ساتھ ساتھ کچھ نیا کر گزرنے کی دُھن سے بھی پہچانا گیا۔ پروگرام ''میں اور آپ'' نے اسے ہر گھر کا فرد بنا دیا۔ اور شاید اُس کے کام نے اُس کے فن پر بھی اثر ڈالا۔ سکرپٹنگ، ریکارڈنگ، ایڈیٹنگ، زوم اِن، زوم آؤٹ وغیرہ سے پیدا ہونے والا ''سلیقہ اور باریک بینی'' اُس کے شعر کی تراش خراش میں بھی نظر آئی۔ محمد سلیم طاہر نے اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کی جس کی نمائندگی اُس کے سابقہ مجموعے ''تانگھ تریل'' (مسعود کھدر پوش ایوارڈ یافتہ) اور ''کہرام'' کرتے ہیں۔ اُردو میں غزل اور پنجابی میں نظم، اُس کے ہاں غالب رہی۔ ''ہم کو معلوم ہے کیا دستِ حنائی دے گا'' یونیورسٹی میں سلیم طاہر کے زمانۂ طالب علمی ہی سے مشاعروں کی فرمائشی غزل بنی رہی۔ محمد سلیم طاہر کا کلام فنی ریاضت اور کلامِ اساتذہ سے اُس کے شغف کا آئینہ دار ہے۔ اُس کا فنی ارتکاز سب سے زیادہ سلاست پر نظر آتا ہے۔ چنانچہ اُس کے بیشتر مصرعوں کی نثر نہیں بنائی جا سکتی۔ کلاسیکی تلازمات اور تلمیحات جا بجا اُس کے شعری بافت میں گُندھی ہوئی ہیں۔ ''دھوپ میں سایۂ اشجار کہاں تک کھنچیں'' اور ''فاصلہ کتنا ہے برفاب کا اور پانی کا'' جیسے مصرعے روایت کے دروبست میں کئی نئی پرچھائیں کا اضافہ کر کے سلیم طاہر کی اپنی شناخت بناتے ہیں۔ اُس نے ٹھیک کہا ہے:

طرح طرح کے خریدار آتے رہتے ہیں
کوئی تو چیز ابھی تک مری دکان میں ہے

محمد سلیم طاہر کے تازہ مجموعے کا عنوان ''ماتمِ یک شہرِ آرزو'' اُس کے فنی افق پر محیط ایک دائمی ہجر کا عکاس ہے جس میں وصال صرف پیش گوئی تک محدود ہے۔ اُمید ہے پہلے دونوں مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی پذیرائی سے سرفراز ہوگا۔''

خورشید رضوی

محمد سلیم طاہر قافیہ سرائی اور ردیف پیمائی کی تمام منازل سے گزر کر پختگی، روانی اور بے ساختہ پن کے اُس مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں اُس کے شعر کو قاری اور سامع تک رسائی کے لیے کسی ناقد یا شارح کی مدد درکار نہیں۔ گھسے پٹے قافیوں کو اُس کی غزل میں داخلے کی اجازت نہیں ملی۔ نئے نویلے قوافی کے موجودہ بے ہنگم ہجوم نے اُسے کبھی متاثر نہیں کیا۔ شعر کی تفہیم اگر متقاضی ہے، تلازمات اگر اجازت دیں، تو حرف اُس کے مصرع میں باریابی پاتا ہے۔ ورنہ ہرگز نہیں۔ اُس کی غزلوں میں دو دو، تین تین لفظوں کی مرکب ردیفیں اپنا الگ رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ مشاعرے لوٹنے والے شاعروں کی ٹولی نے چھوٹی بحر، رواں دواں قافیے اور آسان فہم مضامین کی آمیزش سے کامیاب چورن تیار کر رکھا ہے۔ سلیم طاہر کے یہاں اس کی کوئی پذیرائی نہیں وہ تو پیچیدہ اور تہ در تہ مضمون کو بھی کھلے بازوؤں سے ہم آغوش کرتا ہے۔ اُسے شعری لوازمات سے سجاتا ہے اور اپنی مخصوص ڈکشن کے بال و پر لگا کر کھلی فضا میں چھوڑ دیتا ہے۔

عارف وقار (بی بی سی)

ماتمِ یک شہرِ آرزو

محمد سلیم طاہر

مکتبہ جدید

ہیڈ آفس: 14۔ ایمپرس روڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	:	ماتمِ یک شہرِ آرزو
ناشر	:	حسن رشید رامے
صفحات	:	224
تعداد	:	1000
مطبع	:	مکتبہ جدید پریس
کمپوزنگ	:	حافظ محمد عبداللہ
سنہ اشاعت	:	2026ء
قیمت	:	2000 روپے
سرورق	:	سہیل احمد چوہان
رابطہ۔محمد سلیم طاہر	:	0300-9411595 177-C گلشن راوی، لاہور
پسِ ورق تصویر	:	حفیظ طاہر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾
لَمۡ یَلِدۡ ۬ۙ وَ لَمۡ یُوۡلَدۡ ۙ﴿۳﴾ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ
کُفُوًا اَحَدٌ ٪﴿۴﴾

تم فرماؤ وہ اللہ ہے وہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ
اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اس
کے جوڑ کا کوئی

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

اسد اللہ غالبؔ

انتساب

سب پسماندہ بستی والے
اُس کی اِک آواز پہ لپکے
اور وہ تنہا
حق کا داعی
آنے والی نسلوں کی بہبود کا طالب
چہرے پر اک عزم لیے خاموش کھڑا تھا
اُس کی آنکھیں سوچ رہی تھیں
اِک اِک چہرہ کھوج رہی تھیں
دیکھنے والے دیکھ رہے تھے
اُن میں پیدا ہونے والا
پلنے والا
بڑھنے والا
آج تناور پیڑ ہوا تھا
اور صفا کے دوش کے اوپر
پتھر سے مضبوط اِرادہ رکھنے والا
ایک نیا انسان کھڑا تھا

اُس نے کہا تھا، مَیں کیسا ہوں؟

سب نے کہا، تُو اچھا ہے!

وعدے کا پابند ہوں کتنا؟

تُو وعدے کا پکا ہے!

اس نے کہا، میں تم لوگوں کی چیز امانت رکھتا ہوں

تم میں سے کوئی بتلائے

کیا اُس میں خیانت کرتا ہوں؟

سب نے کہا، اک تجھ ہی پر تو لقب ''امیں'' کا سجتا ہے!

اپنے گھر میں چین سے سوئے

جو بھی تمھارے پاس اپنی کوئی چیز امانت رکھتا ہے

اُس نے کہا کہ کیا کہتے ہو، میری ذات کے بارے میں؟

سب نے کہا تھا، تجھ سے بہتر کوئی نہیں ہے!

عرب کے خطے سارے میں

اُس نے کہا، گر مَیں یہ کہہ دُوں اس پربت کی اوٹ سے

تم پر دشمن کا اِک حملہ ہونے والا ہے

سب نے کہا کہ تو کہتا ہے، تو یہ حملہ واقعی ہونے والا ہے!

اُس نے کہا تھا، غور سے سننا!!

میرے منہ سے اب جو بھی اک بات نکلنے والی ہے

اُس سے نسلِ آدم کی ہر قدر بدلنے والی ہے
جس کے ہاتھ میری سانسیں اور تمھاری جانیں ہیں
اُس کے آگے جھک جائیں سب جتنی کڑی کمانیں ہیں
زندہ، مُردہ کائنات کا وہ اِک تنہا مالک ہے
وہ ہی پتھر میں کیڑے کو رِزق مہیّا کرتا ہے
اور وہ ہوتا ہے دنیا میں جو وہ تہیّہ کرتا ہے

میرے ذریعے ہی اب اُس نے تم کو ہدایت دینی ہے!
جھوٹ کا چہرہ فق کرنا ہے
سچ کو حمایت دینی ہے
رِفعت پر سچائی سجی تھی
پستی میں شیطان کھڑا تھا
عقل کا چہرہ کِھل اُٹھا تھا!
جہل وہاں حیران کھڑا تھا !
اِک اِک بُت بے جان کھڑا تھا!

میں شہرِ محبت سے نِکل آیا تھا اِک روز
لیکن میں مضافات سے باہر نہیں نِکلا

لہور، مرا یار!

مِٹھیاں مٹھیاں گلاں کردا
نِما نِما ہسدا
مَیں نئیں رہندا لہور دے اندر
لہور مرے وِچ وَسدا

بچپن توں ایہدی ممتا
میرے لہو دے اندر دوڑے
میرے نال جوان ہوئے نیں
ایہدے گُھگّو گھوڑے
ایہدا نِکھ معشوقاں وانگوں
سینے دے وچ دَھسدا
میں نئیں رہندا لہور دے اندر
لہور مرے وچ وسدا

لہور شہر دے لوکی مِصری ، شہد ، کھڈونے کھنڈ دے
لہور شہر دے گلی ، محلے پیار محبت ونڈ دے
اِک واری جیہڑا لہور نوں تک لئے دوجی وار ترسدا
میں نئیں رہندا لہور دے اندر
لہور مرے وِچ وَسدا

اِک واری جیہدے پیراں میرے لہور دِی مٹی چُم لئی
اپنی تھاں تے کھڑے کھلوتیاں اوہنے دَھرتی گُھم لئی
او فِر مڑ مڑ ایس مٹی تے اپنا مَتھا گُھسدا
میں نئیں رہندا لہور دے اندر
لہور مرے وِچ وَسدا

ماتمِ یک شہرِ آرزو

(دیباچہ)

ہمارے ادبی منظرنامے میں محمد سلیم طاہر کا طلوع ایک خوب صورت پنجابی نظم سے ہوا جس کا عُنوان ''بگُّو گوشے'' تھا- یہ گزشتہ صدی کے غالباً ساتویں عشرے کی بات ہے- اس حِسّیاتی نظم نے بہت سے پنجابی پیاروں کو ہی نہیں، اُردو شاعروں کو بھی بہت متاثر کیا- اُس وقت محمد سلیم طاہر اُردو میں بھی شاعری کر رہے تھے- ''کہرام'' اُن کا پہلا اُردو غزل کا مجموعہ احمد ندیم قاسمی صاحب کے جن تاثرات کے ساتھ شایع ہوا- اُس کی کچھ سطریں ملاحظہ کیجیے- وہ ''کہرام'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''شاعر کے سامنے دورِ حاضر کی بے معنویت ہے، سنگین نوعیت کا سنّاٹا اور تنہائی ہے، بے بسی ایک مستقِل مسافرت ہے، حُسن کا زندگی بخش لمس ہے، اپنی شخصیت کی شفافیّت ہے اور وہ ازلی و ابدی سوال ہیں جو ہر دَور میں، ہر زبان کے شاعروں نے مشیّت سے پوچھے ہیں کہ یہ انسان ــــــ یہ بھٹکا ہوا آہُو، آخر کس کی تلاش میں ہے اور وہ دشت کے بگولے کی طرح ازل سے اب تک کیوں سرگرداں ہے! یہی محمد سلیم طاہر کے موضوعات ہیں اور یہی اس کی شاعری کا محور ہیں-''

قاسمی صاحب کی نظر میں اپنے زمانے کے سارے شعری میلانات تھے- عہد آفریں ''فنون'' کے ذریعے اُن کا رابطہ ہر نسل کے اہلِ قلم سے تھا- اُنھوں نے محمد سلیم طاہر کے شعری مزاج، صلاحیّت اور اس کے تخلیقی امکانات کے حوالے سے اس کے فنکارانہ جوہر کی

بجا طور پر حوصلہ افزائی فرمائی۔

محمد سلیم طاہر کے لیے قاسمی صاحب کا یہ دیباچہ ایک اہم ''اعتباری سند'' کا درجہ رکھتا ہے، حوصلہ افزائی سے بڑھ کر — آگے کی کوئی چیز!

محمد سلیم طاہر نے اپنی دوسری مصروفیات میں اپنے اوّلین شوق (غزل) کو فراموش نہیں کیا اور اِس مقبول صنفِ سخن سے نہ صرف مستقل رابطہ رکھا، بل کہ اس کے تخلیقی امکانات سمیٹنے میں مسلسل کوشاں رہا۔

یہاں معروف شاعر خورشید رضوی صاحب کی رائے بھی محمد سلیم طاہر اور اُس کے فن سے محبت کی مہمیز ہے، وہ کہتے ہیں:

''محمد سلیم طاہر نے اس مجموعے کا مسوّدہ مجھے دکھایا، تو مجھے اندازہ ہوا کہ کچّی کونپل اور پانی کی سَوت کتنی گہری اور کس قدر سخت جان چیزیں ہیں۔ وہ سنگین چلمنوں کے پیچھے لامتناہی انتظار کر سکتی ہیں۔

مجھے حیرت ہوئی کہ محمد سلیم طاہر نے اتنے عرصے اپنی اصل کو کیوں کر اوجھل رکھا اور یہ مجموعہ اب سے بہت پہلے کیوں نہ سامنے آ گیا، غالباً اِس میں فنکار کی کاہلی کے علاوہ اُس کی مثالیت پسندی کو بھی دخل رہا ہوگا۔

حیرت، اچھے فن کا جزوِ اعظم ہے۔ حیرت، جو زندگی کے مانوس اور سادہ سادہ پہلوؤں میں چھپی بیٹھی رہتی ہے، لیکن سچّے فنکار کے سوا کسی کو نظر نہیں آتی۔ محمد سلیم طاہر کے ہاں اِس حیرت کے رنگ بھی ہیں اور چھ سمتوں کی مانوس دنیا سے ہٹ کر ساتویں دَر کی تلاش بھی۔

مقامِ اطمینان ہے کہ محمد سلیم طاہر نے اپنے دل میں اس حیرت کو بھی زندہ رکھا اور ساتویں دَر کی تلاش بھی ـــــ بے بہرہ حیرت آئینے کی طرح ہوتی ہے، اگر شاعر کی کھلی آنکھوں میں شوقِ بے تابی ہی نہیں تو پھر اِس تماشے کا کیا فائدہ، میرزا بیدل نے کیا خوب کہا،

از تماشا حیرتِ بی بھرہ چون آئینہ است
شوق بیتابی نباشد دیدۂ باز تورا

محمد سلیم طاہر نے حیرت کے سفر کو اپنے انداز میں جاری بھی رکھا اور الفاظ و معانی کے آئینے سے وہ حیرتیں بھی کشید کیں، جو تخلیقی ذہن کی متاع ہوتی ہیں - اِس حیرت نے انھیں خلوت اور جلوت میں سرگرمِ کار رکھا- یہ حیرتیں اُن کے تازہ مجموعہ ''ماتمِ یک شہرِ آرزو'' میں زیادہ وضاحت اور دل آویزی کے ساتھ ظاہر ہوئی ہیں-

محمد سلیم طاہر شہر شہر منعقد ہونے والے مشاعروں سے دور رہے- ٹی وی کی ملازمت کے زمانے میں اُن کی منصبی ضروریات کے ہمہ پہلو اِنہاک کا تقاضا بھی شاید یہی تھا- انھوں نے کم کم لکھا، لیکن وہ اپنے تخلیقی کام سے کبھی غافل نہیں رہے-

اُن کا زیرِ نظر شعری مجموعہ ''ماتمِ یک شہرِ آرزو'' اِس کا گواہ ہے کہ وہ حسبِ ضرورت ''پرورشِ لوح و قلم'' کرتے رہے- بجا کہ محمد سلیم طاہر نے اپنی شاعری کا بڑا حصّہ اِخفا میں گزارا ہے، لیکن اپنی شعری شخصیت کو مستور الحال رکھنے کے باوصف، شاعری کا داعیہ اُن کے اندر پروان چڑھتا رہا اور اب، جب اُن کا دوسرا مجموعۂ کلام سامنے آرہا ہے، تو پتا چلتا ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں سے رُونما ہونے والے تجربے اُن کی شاعری میں پوری آب و تاب کے ساتھ جھلمِلا رہے ہیں-

محمد سلیم طاہر کے کلام میں الفاظ کے دَر و بَست اور بعض کم استعمال ہونے والے، لیکن شعری تلازمات سے بھرے لفظوں کا بے ساختہ استعمال اسی داعیہ کا نتیجہ ہے- اُن کے یہ شعر دیکھیے ان میں خط کشیدہ الفاظ دراصل اس نئے پن کی علامت ہیں-

شاعری میں نسبتاً کم کم استعمال ہونے والے یہ الفاظ کیسے کیسے جمالیاتی تجربوں کے سیاق و سباق سے آمیز ہوکر اُن کے شعری تجربات کا حصہ بنے ہیں، کمال کی معنویت سے لبریز ہیں۔-یہی لسانی تازہ کاری ہے، جو محمد سلیم طاہر کی غزل گوئی کا ایک نمایاں وصف ہے-

سب کہہ رہے تھے، شہر سے ہجرت کا وقت ہے
مَیں نے بھی ایک پوٹلی میں گھر اُٹھا لیا

زخم بخشے ہیں تری یاد کی سِسکاری نے
رکھ دے ہونٹوں پہ کوئی پھول سا پھاہا ، آہا

کتنے موقعوں پہ مرے دل نے دھڑکنا چھوڑا
بارہا تُو نے مرے دل کو تڑاہا ، آہا

بیٹھ کر عمر کی دہلیز پہ کاتی ہے کپاس
قریۂ میرؔ کا ہوں ایک جُلاہا ، آہا

محمد سلیم طاہر کے ہاں بھی جُلاہا کا لفظ اپنے تلازمات میں کیسا خوب صورت نقشہ پیش کرتا ہے:

یہ مری آنکھ کسی سمت ٹھہرتی ہی نہیں
یہ ترا حُسن ہے یا پینگھ ہُلارے میں ہے

کب مَیں پھرتا تھا یوں اُداس اُداس
اے محبت ! تمھارا ستیاناس

اُس کے مِلنے کا گرم گرم احساس
اور پھر ٹھنڈی ٹھار تنہائی

معاصر اُردو غزل میں Neology کی ایسی تمام مثالیں لائقِ تعریف ہیں، جن میں بظاہر غیر شاعرانہ الفاظ کو شاعری کا حصّہ بنا کر اُنھیں تخلیقی شعری جمالیات سے آمیز کیا جائے۔

میر تقی میر کا ایک شعر دیکھئے:

پھوڑا سا ساری رات جو دُکھتا رہے گا دِل
تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

میرؔ نے اس شعر میں پھوڑا جیسے کریہہ الصّوت غیر جمالیاتی لفظ کو کس معنویت کے سیاق و سباق میں پیش کر کے کیا خوب صورت تشبیہ دی ہے- وہ بتاتے ہیں کہ دل کو اب تھام لیتے ہیں کہ گھبراہٹ میں کچھ سکون مل جائے، لیکن یہ جس طرح دُکھ رہا ہے، صبح تک اِسے تھامنا تو کیا، اِسے ہاتھ بھی نہ لگایا جا سکے گا -کیا سچّی تشبیہ ہے، جو اپنے سیاق و سباق میں درپیش صورتِ حال کی وضاحت کرتی ہے- ایسا ہی کچھ کام محمد سلیم طاہر نے کیا ہے-

شاعر کی تازہ کاری کا ایک حوالہ اُس کی شعری زمینیں ہوتی ہیں۔ہر تخلیقی شاعر کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے تجربات کے اظہار کے لیے نئی زمینیں تراشے اور تلاش کرے- اصل میں تو نئی زمینیں (قافیہ، ردیف اور بحر) نئے شعری تجربات لے کر آتی ہیں-

جتنا تجربہ نیا ہوگا وہ از خود ایک نئے اور تازہ مصرع یا مطلع میں ڈھل کر سامنے آئے گا- پرانی زمینیں ،فرسودگی ،کلیشے (Cliche) بن جاتی ہیں اور اُن کی تازہ کاری کے امکانات کم سے کم ہو جاتے ہیں،مثلاً

جنوں ہے
یوں ہے
جنوں ہو
تو
غزل ہوتی ہے

اور سوالات پہ رونا آیا،

وغیرہ

یہ اتنی شاعری ہو چکی ہے کہ اب ان زمینوں میں نئے شعر نکالنا قریب قریب ناممکن ہے- شاعر جتنا اوریجنل ہو گا اپنے تجربات، واردات کا اظہار نئی شعری زمینوں میں کرے گا- ایسی زمینوں میں، جو اُس کے احساسات کا ساتھ دے سکیں-

اس حوالے سے محمد سلیم طاہر کی تازہ کاری ان اشعار میں دیکھیے، جن میں الفاظ کا در و بست، طرزِ ادا کی جدّت اور زمینوں کی تازگی نے محمد سلیم طاہر کے جمالیاتی اظہار میں اضافہ کیا ہے:

بدگمانی کی بھی آخر کوئی حد ہے ، حد ہے!
اپنی صورت سے بھی اب مجھ کو حسد ہے ، حد ہے!

قدم قدم پہ ارادوں کا رُخ بدلتے ہوئے
مَیں رو پڑا تھا ترے شہر سے نکلتے ہوئے

مدّت سے مری آنکھ میں پانی بھی نہیں ہے
رونے کے لیے کوئی کہانی بھی نہیں ہے

کیا حال پوچھتا ہے زمانہ مزاج کا
اب تک وہی ہے رنگ پُرانا مزاج کا

انبوہ سے گزرے کبھی انبار سے گزرے
ہم بھیڑ میں تنہائی کے آزار سے گزرے

ہر شعری زمین تخلیقی شاعر کے لیے امکان کی حیثیت رکھتی ہے یہ نہ صرف خیالات کے بہاؤ کو منضبط (Sizeable) رکھتی ہے، بل کہ مجموعی طور پر غزل کے احساساتی بہاؤ کو منظّم بھی رکھتی ہے۔

محمد سلیم طاہر نے ان تازہ زمینوں سے کئی خوب صورت شعر نکالے ،ان زمینوں کے توسّط سے اسے تازہ بیانی کے کئی مواقع مِلے،جس کا محمد سلیم طاہر نے بھرپور فائدہ اٹھایا- ان زمینوں میں متوسّط اور بعض چھوٹی زمینیں بھی ہیں ۔بعض ردیفیں تین تین الفاظ پر مشتمل ہیں اور بعض چار چار لفظوں پر —— محمد سلیم طاہر کی شاعرانہ اور تخلیقی استعداد نے ان زمینوں میں خوب صورت شعر نکالے ہیں۔ان زمینوں میں کہے گئے اشعار میں بناوٹ اور تصنّع نہیں، کچھ مثالیں اور دیکھیے:

کُوزے میں آب ، خاک میں دانہ تو ہے نہیں
پھر بھی یہ شہر چھوڑ کے جانا تو ہے نہیں

سر میں سَودا بھی ہے اور خاک بھی ڈالی ہوئی ہے
دونوں ہاتھوں سے یہ دستار سنبھالی ہوئی ہے

منظر کو جو دیکھیں تہ و بالا نظر آئے
اوپر سے سمندر بھی پیالہ نظر آئے

دِل و جاں ہار کر بیٹھا ہوا ہوں
میں خود کو مار کر بیٹھا ہوا ہوں

گر ترے نام کا نہیں ہوں میں
پھر کسی کام کا نہیں ہوں میں

محمد سلیم طاہر کی شاعری کا حِسیّاتی نظام بھی توجہ طلب ہے۔حِس آمیزی (Syaethesia) نے ان کے شعری تجربوں کو نئی صورتوں میں ظاہر کیا ہے۔
یہ اشعار دیکھیے، جن میں اُنھوں نے مختلف حِسّوں کو آمیز کر کے اپنے شعری تجربات بیان کیے ہیں۔موجود سے لاموجود کی دریافت اور معلوم سے نامعلوم کی بازیافت ہر شاعر کے ہاں پائی جاتی ہے۔ محمد سلیم طاہر نے اپنی شاعری میں غم وخوشی اور وصال و بعد کے تجربات ایسے ہی حِسیّاتی حوالوں میں بیان کیے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

کرتی نہیں ہے کوئی دقیقہ فروگزاشت
دیوارِ حسنِ یار کی آنکھیں ہیں ، کان ہیں

وہ گل مہک رہا تھا سرِشاخسارِ چشم
مَیں خاک میں ملائی ہوئی تازگی تھا بس

اپنے بستر پہ پڑے دیکھتے رہنا چھت کو
آنکھ کا جاگنا اور جسم کا سونا کیا ہے

چلتے پھرتے بھی ترے خواب نظر آتے ہیں
نیند بھی دیدۂ بیدار میں رکھی ہوئی ہے

مری دُعا سے ہتھیلی چمکنے لگتی ہے
میں ہاتھ اٹھا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

نہ جانے کون مرے جیسا مجھ کو دیکھتا ہے
میں ڈرتا رہتا ہوں آئینہ صاف کرتے ہوئے

تکتا رہتا ہوں میں تصویر بنا کر اُس کی
دیر تک ہاتھ نہیں دھوتا میں رنگوں والے

اتنا سنّاٹا میری ذات میں تھا
جسم پر کان سے نکل آئے

محمد سلیم طاہر کی غزل میں تمثالوں کی تازگی بھی قاری کی توجہ، اپنی جانب کھینچتی ہے۔تمثالیں یا امیجز شاعری کا حُسن ہوتے ہیں، تجربے اپنے اِظہار کے لیے محاکات تلاش کرتے ہیں، تو شاعر کے لفظ تصویریں بن جاتے ہیں- یوں نہ صرف شعری تجربے کی بازیافت بامعنی اور مؤثر ہو جاتی ہے، بل کہ خیال کی تفہیم بھی آسان ہو جاتی ہے-

محمد سلیم طاہر کی کم و بیش تمام غزلوں میں امیجز کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔تازہ مثالیں، متحرک ڈرامائی امیجز، کنکریٹ اور (ابسٹریکٹ)(Abstract) امیجز وغیرہ- اس کے ساتھ کہیں کہیں مُکالمے نے ان محاکاتی تصویروں کو گویا کر دیا ہے-

اس کے کلام میں امیجز کی یہ مثالیں دیکھئے:

یہ جو جگنو ہے ، بغاوت ہے اندھیرے کے خلاف
اپنا دم سادھ کے بیٹھے ہیں چراغوں والے

ہم تو اندھے ہیں دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی
دیکھ کر کیوں نہیں چلتے یہاں آنکھوں والے

نشیب میں کوئی جیسے لُڑھکتا جاتا ہے
کچھ اس طرح سے گزرتی ہے عمر ڈھلتے ہوئے

مرے آئینے مری عاجزی سے کلام کر
ترا ایک واقفِ حال ہے ترے سامنے

دروازے پہ دستک دیے بیٹھا ہے بڑھاپا
اور کمرے میں بچپن بھی ، جوانی بھی نہیں ہے

پھٹی قمیص کے کالر سے ناک پونچھتا ہے
کسی غریب کا بچہ سکول جاتے ہوئے

حسّاسیت کی جو تہ محمد سلیم طاہر کے کلام میں نظر آتی ہے، معاصر شاعری میں کم کم دکھائی دیتی ہے - محمد سلیم طاہر نے تنہائی کو محسوس ہی نہیں کیا، بل کہ اُس کو اوڑھا اور برتا بھی ہے۔عصرِ حاضر میں شہر جیسے جیسے پھیلتے جاتے ہیں، حسّاس لوگوں کے اندر کی تنہائی بڑھتی جاتی ہے۔ ''تنہائی'' ردیف والی غزل میں، محمد سلیم طاہر نے اپنے اندر کی تنہائی کی ٹھوس اور مجسّم شکلیں پیش کی ہیں۔ کالرج کی ایک لائن یاد آرہی ہے۔کچھ اس طرح......

The Darkness was so thick that you could touch it

(اندھیرا اِتنا مجسّم تھا کہ تم اُسے چُھو سکتے تھے)

محمد سلیم طاہر کے یہ شعر دیکھیے:

اِک ملاقات اور اُس کے بعد
اَن گنت بے شمار تنہائی

زندگی کس طرح گزارتے ہیں
جن کے ہے آر پار تنہائی

آنکھ سے رفتہ رفتہ چُھوٹتی ہے
دانہ دانہ انار تنہائی

بجُھ رہا ہے چراغ جلتا ہوا
ہائے ! بے اختیار تنہائی

ملنے والوں کے پاس وقت نہیں
سر جھٹک کر گزار تنہائی

دیکھیں ! محمد سلیم طاہر نے تنہائی کی مختلف شکلوں کو کیسے شعر بند کر کے تمثیلی کردار بنا دیا ہے ۔ محبت، محمد سلیم طاہر کی شاعری کا بنیادی استعارہ ہے۔اس کے کلام میں محبت کی مختلف شکلیں، مختلف تجربوں کی صورت میں ملتی ہیں۔اپنے اشعار میں اُس نے صرف اپنی ہی نہیں، سماج اور ماحول کی بات بھی کی ہے ۔

اہلِ فن بخوبی جانتے ہیں کہ شاعر کا ''مَیں'' اس کے ہر شعر میں اُس کا اپنا ''مَیں'' نہیں ہوتا، وہ اپنے شعروں میں ''مَیں'' کے صیغے کو تعمیمی صورت میں استعمال کرتا ہے۔اس ''مَیں'' میں پورا سماج بولتا ہے۔

محمد سلیم طاہر کی شاعری میں بھی کئی ایسے محسوسات ، مشاہدات اور تجربات کا بیان ہوا ہے، جس کا تعلق شاعر کی ذات سے بڑھ کر اُس کے معاشرتی ماحول اور کرداروں تک پھیل جاتا ہے۔ محمد سلیم طاہر کے کچھ اشعار دیکھیے، جن میں ہم ، مَیں ،ہمیں ، مجھے ، میرا اور ہمارا وغیرہ کی ضمیریں عمومی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہم سے پراگندہ طبیعت بھی مُعَطّر ہو جائیں
ہم کو بھی پاس بٹھا لے کبھی پھولوں والے

جب تھا تو بہت پختہ تھا اک شخص سے رِشتہ
ٹُوٹا ہے تو اب ٹکڑے سنبھالے نہیں جاتے

مجھے چُپ سے بات نکالنے کا ہنر ملا
یہی مجھ میں ایک کمال ہے ترے سامنے

مَیں جسے اپنی محبت کی اکائی سمجھا
اُس نے تو چھوڑ دِیا ہے مجھے آدھا کرکے

آئے ہو ابھی، ٹھیک سے بیٹھے بھی نہیں ہو
یہ کیا کہ ابھی سے تمھیں جانے کی پڑی ہے

بجھنے لگتی ہیں کئی جلتے چراغوں کی لَویں
کتنے دھڑکے ترے انکار سے لگ جاتے ہیں

تیرے رخسار کے رنگوں سے مہک پھوٹتی ہے
غنچے کھل کر تری گفتار سے لگ جاتے ہیں

اُس کو بھی لگا لیتے ہیں ہم اپنے گلے سے
تیرا جو کوئی چاہنے والا نظر آئے

محبت کی شاعری کی طرح معاشرے کی ناانصافی، ظلم، تشدد اور سماجی و معاشرتی ناہمواریوں نے جس طرح زندگی کو ویران کر کے رکھ دیا ہے۔ محمد سلیم طاہر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا، اس کے ٹی وی پروگراموں میں معاشرے کے جو تضادات اور ناانصافیاں اُس کی نظر سے گزری ہیں، اُن کا عکس اُس کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔

اِس کے یہ شعر دیکھئے:

تیرے اِصرار پہ رکھا تھا کہانی میں تجھے
اب ترا کھیل میں کردار کہاں تک کھینچیں

مرہم ہر ایک زخم پہ رکھا نہیں گیا
اب بھی کٹے پھٹے ہوئے کچھ خاندان ہیں

اِک قہقہہ تھا ، جو کبھی کُھل کر نہ لگ سکا
میں اپنے حالِ زار پہ اُس کی ہنسی تھا بس!

بیٹھ کر سُونی منڈیروں پہ فلک دیکھتا ہوں
حوصلے پست ہوئے مجھ میں پرندوں والے

تم کبھی دام لگاتے ہوئے اُس کو دیکھو!
اِک رَعُونت سی خریدار میں رکھی ہوئی ہے

جو بھی ملتا ہے ، بغاوت پہ اُتر آتا ہے
کچھ کجی شہر کی دیوار میں رکھی ہوئی ہے

سر پہ سُورج ہو ، تو سائے کی دُعا مانگتے ہیں
یہ محبت ہے ، جو اشجار میں رکھی ہوئی ہے

مَیں جانتا ہوں اندھیرے کی حکمرانی ہے
مَیں سر جھکا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

تری تقسیم کے آداب نے حیران کر ڈالا
ترے حصّے میں پورا ہے مرے حصے میں آدھا ہے

کسی نے میرے سارے پیڑ طاہرؔ کاٹ ڈالے ہیں
مری یادوں میں خوشبو ہے نگاہوں میں بُرادہ ہے

بحیثیت مجموعی محمد سلیم طاہر کا زیرِ نظر مجموعۂ غزل ''ماتمِ یک شہرِ آرزو'' اُس کے سابق تخلیقی اثاثے میں ایک اہم اضافہ ہے، جس میں محبت اور سماج دونوں کی عکاسی اُس نے بھرپور شاعرانہ جمالیات سے کی ہے۔

اپنے مواد، موضوعات اور پیشکش، ہر اعتبار سے اُس کی غزل اپنے عصر کی جان دار اور منفرد غزل ہے۔ اُس کے اُسلوب میں کلاسیکی غزل کی شائستگی کے ساتھ معاصر رجحانات کی بازآفرینی قابلِ توجّہ ہے۔

اُس نے اپنے تجربات کو تناظرات کے ساتھ، جو جدید طرزِ احساس دیا ہے وہ اُس کی شاعرانہ مہارت کا گواہ ہے۔ مجھے اُمید ہے! اُس کا یہ مجموعۂ غزل جہاں اُس کے دیرینہ رفیقانِ سفر کے لیے بہجت و مسرت کا باعث ہوگا، وہاں اردو غزل کے تازہ کاروں کے لیے بھی خوش آیند ہوگا۔

میں اپنے تاثرات اس رباعی پر ختم کرتا ہوں:

ہے آپ سے دوبدو سلیمِ طاہر
نِت وقت کے روبرو سلیمِ طاہر
صِرف ایک ، یہ آرزو نہیں اپنے میں
اِک شہر ، ہے آرزو سلیمِ طاہر

پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید
ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس - فیصل آباد

فہرست

1	انتساب	5
2	لہور، مرا یار!	9
3	ریاض مجید (دیباچہ)	11
	حمد	
4	اے مرے ربِّ کائنات مدد میرے درپے ہیں حادثات مدد	37
	نعتؐ	
5	ہر روز نکلتا ہوں مدینے کے سفر پر مُجھ کو مرے احباب نہ ڈُھونڈیں مرے گھر پر	39
6	سخت مُشکل میں ہوں اک خواہشِ سادہ کر کے توڑ بیٹھا ہوں کئی بار ارادہ کر کے	41
7	فاصلہ کتنا ہے برفاب کا اور پانی کا مسئلہ حل نہ ہوا آنکھ کی حیرانی کا	43
8	اِس تکلف میں ترے ہوش ٹھکانے لگ جائیں مجھ تک آتے ہوئے جا تجھ کو زمانے لگ جائیں	45
9	سورج چلا جاتا ہے ، اُجالے نہیں جاتے کچھ لوگ کبھی دل سے نکالے نہیں جاتے	47
10	شوق اِس عمر میں بھی ہیں مرے بچوں والے ڈھونڈتا رہتا ہوں گلیوں میں کھلونوں والے	49
11	کوزے میں آب ، خاک میں دانہ تو ہے نہیں پھر بھی یہ شہر چھوڑ کے جانا تو ہے نہیں	51
12	کل شب غزل پڑی رہی پاؤں پسار کر کاغذ پہ اُس نے رکھ دیئے گہنے اُتار کر	53

13	اگرچہ شاد ہیں ناشاد بھی ہو جائیں تو کیا تری خاطر جو ہم برباد بھی ہو جائیں گے تو کیا	55
14	دریا تھا ، مگر ایسی روانی میں نہیں تھا خود سر میں کبھی اتنا جوانی میں نہیں تھا	57
15	دُکھ ہوتا ہے دُکھ ، کم یا زیادہ نہیں ہوتا رو پڑتے ہیں ، رونے کا ارادہ نہیں ہوتا	58
16	مکان رہتے ہیں خاموش گھر نہیں کُھلتے کئی مکینوں پہ دِیوار و دَر نہیں کُھلتے	60
17	جو آسمان ہے یہ کون سارا مانگتا ہے یہ دل تو تم سے فقط اِک ستارا مانگتا ہے	62
18	جانے کیا فرق ہے جینے میں جیئے جانے میں زندگی ہم نے گزارا تجھے ہرجانے میں	64
19	بنیاد ڈال دی ہے تو دیوار و در نِکال اے خواہشِ جنُوں مرے اندر سے سر نکال	66
20	نقدِ جاں جیب میں رکھ ، عشق اُدھارے پہ چلا اس گِرانی میں دُکاں اپنی خسارے پہ چلا	68
21	نہ جانے کیسے تری دسترس میں آ گیا تھا ہوا میں اُڑتا پرندہ قفس میں آ گیا تھا	70
22	اِک تہجّد گُذار تنہائی ہے مری یارِ غار تنہائی	71
23	صبح دَم جاگتے ہیں آئینے شاخ پر پُھوٹتے ہیں آئینے	74
24	یہ جو اک چاند ہے سِتارہ ہے اس پہ کیا کوئی حق ہمارا ہے	76
25	محبت زنگ آلُودہ کڑی ہے مگر زنجیر کے دِل میں پڑی ہے	77
26	تیرے ہوتے ہوئے یہ میرا نہ ہونا کیا ہے یہ مرا دِل ہے یا ہے کوئی کِھلونا کیا ہے	79

27	کوئی بھی ربط خُدا کی قسم نہیں رکھا پھر اُس کے شہر میں ہم نے قدم نہیں رکھا	81
28	سفر موقوف ہے اور قافلہ ٹھہرا ہوا ہے تھکن کے شہر میں اِک رتجگا ٹھہرا ہوا ہے	82
29	گردشِ وقت یہ خاشاک اُٹھا کر لے جا شیشۂ جاں پہ جمی خاک اُٹھا کر لے جا	84
30	بدگمانی کی بھی آخر کوئی حد ہے ، حد ہے اپنی صورت سے بھی اب مجھ کو حسد ہے ، حد ہے	86
31	بہت سے فیصلے اپنے خلاف کرتے ہوئے میں تھک گیا ہوں انا میں شگاف کرتے ہوئے	88
32	منھ سے میرے نہیں نکلا کبھی آہا آہا ہاں مگر میں نے تجھے ٹُوٹ کے چاہا آہا	90
33	اُس کی آنکھیں یاد ہیں اُس کا چہرہ گم بس اتنا ہی حِفظ ہے باقی حافظہ گُم	92
34	دُکاں سے نقد اٹھاکر اُدھار پھینکنا ہے خود اپنی خاک اُڑا کر غُبار پھینکنا ہے	94
35	یہ جو دستِ شام پہ جل رہا ہے ستارا ایک چراغ سا مجھے اُس کی آنکھ سے مل رہا ہے اشارہ ایک چراغ سا	96
36	ہم نے جو وقت اندھیرے میں گزارا ہے میاں روشنی پر یہی احسان ہمارا ہے میاں	98
37	دیکھا نہیں تُجھ کو ، نظر آئی نہیں دُنیا مجھ کو مری آنکھوں نے دکھائی نہیں دُنیا	100
38	ذرا سی دیر تو دِل میں ملال رہتا ہے پھر اُس کے بعد تمہارا خیال رہتا ہے	102
39	خوش فہم تھا میں پیڑ لگانے سے پیشتر پھل چاہتا تھا پیڑ لگانے سے پیشتر	103
40	کون کہتا ہے کہ دُنیا مجھے خیرات میں دے مجھ کو دینا ہے جو کچھ تو مری اوقات میں دے	105

41	پلٹ کے دیکھا جو میں نے تو تُو دِکھائی دیا پھر اُس کے بعد مجھے چارسُو دِکھائی دیا	107
42	قشقہء غم پسِ دیوار کہاں تک کھینچیں ہم ترے لُطف کا آزار کہاں تک کھینچیں	109
43	جو سر نگاہِ یقین تھا ، وہ غُبارِ راہ چھٹا نہیں وہ جو سنگِ وہم تھا موڑ پر وہی راستے سے ہٹا نہیں	110
44	زخم جب لہجے کی تلوار سے لگ جاتے ہیں ہم اُلجھتے نہیں دیوار سے لگ جاتے ہیں	112
45	خبر نہیں کہ وہ اب کس ہوا میں رہتا ہے یہ اِک فقیر تو ارضِ خدا میں رہتا ہے	114
46	یہ نہیں ہے کہ تمھیں یاد نہیں رَکھا ہے ہاں ، دل خستہ کو آباد نہیں رَکھا ہے	116
47	کڑا پہرہ بٹھا دیتے ہیں نگرانی میں رکھتے ہیں محبت کرنے والے دل کو حیرانی میں رکھتے ہیں	118
48	انبوہ سے گزرے ، کبھی انبار سے گزرے ہم بھیڑ میں تنہائی کے آزار سے گزرے	120
49	جس سے برگشتہ ہوائیں تھیں زمانے بھر کی اُس کی جانب ہی نگاہیں تھیں زمانے بھر کی	121
50	جوانی ختم ہوتی جا رہی ہے کہانی ختم ہوتی جا رہی ہے	123
51	سوادِ ہجر میں سنّاٹا خامشی تک ہے سکوت حبس ہواؤں کی گُدگُدی تک ہے	125
52	میں تو جلا بجھا ہوا اِک آدمی تھا بس! غربت میں اِک چراغ تلے روشنی تھا بس!	127
53	ربط میں جب دراڑ پڑ جائے نرم لہجہ اُکھڑ اُکھڑ جائے	129
54	عکسِ غرورِ حُسن سے ، ششدر نہیں ہوا حیرت کدے میں آئنہ پتھر نہیں ہوا	131

55	قدم قدم پہ ارادوں کا رُخ بدلتے ہوئے میں رو پڑا تھا ترے شہر سے نکلتے ہوئے	133
56	ہم سے جو کام نہیں ہوتا وہ کب کرتے ہیں عِشق تو اِس لیے کرتے ہیں کہ سَب کرتے ہیں	134
57	توفیق ہے تو کچھ مرے کاسے میں ڈال دے ورنہ تری رضا ہے ہوا میں اچھال دے	136
58	اَب صورتِ حالات سے پہلو نہیں بچتا روتا ہوں ، تو پھر آنکھ میں آنسو نہیں بچتا	137
59	بیچ بازار کے گٹھڑی نہیں کھولی جاتی ہر ترازو میں تو خوشبو نہیں تولی جاتی	139
60	دل و جاں ہار کر بیٹھا ہوا ہوں میں خود کو مار کر بیٹھا ہوا ہوں	140
61	گر ترے نام کا نہیں ہوں میں پھر کسی کام کا نہیں ہوں میں	142
62	دِیا بجھا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں میں لَو لگا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں	144
63	جان ، ہیجان سے نکل آئے ناؤ طوفان سے نِکل آئے	146
64	اے لمسِ دستِ یار مرے ساتھ ساتھ چل سُونی ہے رہ گزار مرے ساتھ ساتھ چل	148
65	کیا حال پوچھتا ہے زمانہ مزاج کا اب تک وہی ہے رنگ پُرانا مزاج کا	149
66	کوئی دلیل ، بہانہ ، کوئی جواز نہیں اگر نماز کی نیّت نہیں نماز نہیں	151
67	میں نے اڑان کے لیے جب پَر اُٹھا لیا خواہش نے ایک گھونسلے سے سَر اُٹھا لیا	153
68	منظر کو جو دیکھیں تہ و بالا نظر آئے اوپر سے سمندر بھی پیالہ نظر آئے	154

69	اندھیرے کی کوئی گُنجلک، بجھارت ہو تو کھولوں مری مٹھی میں جگنو ہے، اجازت ہو تو کھولوں	155
70	بہت دنوں سے کئی رنگ اِضطراب میں ہیں جو تم نے پُھول دیئے تھے، مری کتاب میں ہیں	156
71	قریۂ ہجر سے ہم صبح سے پہلے نِکلے بھاگتے بھاگتے سورج سے بھی آگے نِکلے	158
72	جب پائےِ نارسائی نے وحشت کو چُھو لیا منزل نے آگے بڑھ کے مسافت کو چُھو لیا	160
73	دل تو کہتا ہے اُسی قریۂ پامال میں رہ یار جِس حال میں رکھتا ہے، اُسی حال میں رہ	162
74	دامنِ عجز ندامت سے بھرے بیٹھے ہیں تری دہلیز پہ ہم کھوٹے کھرے بیٹھے ہیں	163
75	یہ جو جرأت مرے اظہار میں رکھی ہوئی ہے اس نے ہستی مری پیکار میں رکھی ہوئی ہے	165
76	ہدف بناتے ہیں ہم کو، نشان کرتے ہیں یہ کون لوگ تمھیں بدگُمان کرتے ہیں	167
77	اِس دِل کو ترے ناز اُٹھانے کی پڑی ہے تو ہے کہ تجھے سارے زمانے کی پڑی ہے	169
78	شاخ دَر شاخ ٹھکانے کو بدلتا ہوا میں موسمِ خُشک کا پَروَرْدَہ پَرندہ ہوا میں	171
79	کِس کی حیا کے رنگ مہکتے ہیں بَاغ میں اِک اور بھی سُراغ ہے پنہاں سُراغ میں	173
80	پَلک جھپکنے سے پہلے اِرادہ کرتا ہے جو شخص ہم سے محبت زیادہ کرتا ہے	175
81	اِک دُوسرے سے مُختلف سب کے بیان ہیں یہ لوگ کون لوگ ہیں جو بدگُمان ہیں	176
82	سر میں سودا بھی ہے اور خاک بھی ڈالی ہوئی ہے دونوں ہاتھوں سے یہ دَستار سنبھالی ہوئی ہے	177

83 جو چُپ تھا بولنے لگا تھوڑی سی اَحتیاط 179
باتوں کو تولنے لگا تھوڑی سی اَحتیاط

84 بڑی مدّت سے ہونٹوں پر مرے اک حرفِ سادہ ہے 181
کبھی تم بھی تو بتلا دو ، تمھارا کیا ارادہ ہے

85 شاخِ شِیریں پہ تلخ پھل آیا 182
اَشک اِک آنکھ سے نِکل آیا

86 شاخ سے جب گلاب ٹُوٹتا ہے 183
خُوشبوؤں پر عذاب ٹُوٹتا ہے

87 جب تک سیاہ تِل ترے رُخسار پر رہے 185
رَوشن چراغ شام کی دِیوار پر رہے

88 یقین بُھول چُکا ہے پسِ گُماں رکھ کر 187
تو اپنے تیر تو گِن ہاتھ سے کماں رکھ کر

89 بے جا نوازشات کا تخمینہ بن چکا 188
اب ذکرِ یار قصۂ پارینا بن چکا

90 قریۂ صبر میں ہے ، سوچ کی تحویل میں ہے 190
یہ جو اِک دِل ہے ترے حکم کی تعمِیل میں ہے

91 یوں تو کوئی بھی کام مؤخر نہیں کیا 192
تیری طرح سے دِل کبھی پتّھر نہیں کیا

92 کِرچیاں تعلّق کی عُمر بھر اٹھاتے ہیں 193
ایک توڑ دیتے ہیں ، دُوسرا بناتے ہیں

93 ایک دن اُس نے مری آنکھ میں آنکھیں رکھ دیں 195
دُھوپ میں جیسے بَرستی ہوئی بُوندیں رکھ دیں

94 بکھر گئے ہیں بہت بال و پر پرندوں کے 197
دکھائی دیتے نہیں اب تو گھر پرندوں کے

95 چاند ہوتا ، کوئی سورج کہ ستارہ کوئی 199
کاش ہوتا سرِ افلاک ہمارا کوئی

96 کبھی کُرید کے دیکھا جو کیا نِکلتا ہے 200
کٹا ، پھٹا ہوا ہر رَابطہ نِکلتا ہے

97 وہ کیا تھا ، کیا نہیں تھا ، دماغ اب نہیں رہا 201
خُوشبو کا ایک باغ تھا ، باغ اب نہیں رہا

98 میں کیا کروں بتاؤ دلِ خوش گمان کا 202
اِک اجنبی کو دے دیا ، قبضہ مکان کا

99 کچھ اس لیے بھی تباہی کا میں شکار ہوا 203
کہ مُجھ پہ حملہ محبت کا بار بار ہوا

100 شَشدُر طِلسمِ آئنہ خانہ پڑا ہوا 204
دیکھا ہے اُنؔ کے دَر پہ زمانہ پڑا ہوا

101 رونے کے لیے کوئی کہانی بھی نہیں ہے 206
مدّت سے مری آنکھ میں پانی بھی نہیں ہے

102 کوئی تو ہے جو انھیں دانہ ، دُنکا ڈالتا ہے 207
یہ اِتنے سارے پرندوں کو کون پالتا ہے

103 سودا سفر کا تھا کبھی ، اب سر میں کچھ نہ تھا 208
خُشبوئے رفتگاں کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا

104 کب میں پھرتا تھا یوں اُداس اُداس 210
اے محبت! تمھارا ستیاناس

105 مقتل میں فقط عابدِ بیمار بچے تھے 211
اک قصۂ پُردرد کے کردار بچے تھے

106 واہمہ جب کوئی وجدان میں آ جاتا ہے 212
سایہ چلتا ہوا دَالان میں آ جاتا ہے

107 آنکھ اب چپ نہیں رہتی مری رونے والی 214
مجھ سے اب اَور محبت نہیں ہونے والی

108 اِک شبنمی پھوار نے موسم بدل دِیا 215
یاد آ کے ، یادِ یار نے موسم بدل دِیا

109 روشن قدم قدم پہ مدینے کی راہ ہے 216
دُنیا تجلّیات کی آماجگاہ ہے

110	باندی تھی خادمہ تھی امامت حُسین کی دراصل معجزہ ہے شہادت حُسین کی	218
111	مِدحت سے مہک اُٹھتے تھے گُلزارِ مدینہ مکّے سے نظر آتے تھے آثارِ مدینہ	220
112	جسم ہے چاند میں اور روح ستارے میں ہے عصرِ حاضر کی قسم جان خسارے میں ہے	222
113	یہ جو ایک دستِ سوال ہے ترے سامنے کوئی غم سے کتنا نڈھال ہے ترے سامنے	223

اب طلب ہے نہ کوئی حسنِ طلب باقی ہے
اب تو کل کی بھی پڑی رہتی ہے پیمانے میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حمد

اے مرے ربِّ کائنات ، مدد
میرے درپے ہیں حادثات ، مدد

ایک سُورج طُلوع ہو جائے
ختم ہو جائے کالی رات ، مدد

اپنے پیروں پہ اعتماد نہیں
پار کرنا ہے پُل صراط ، مدد

تیری مرضی ، ترا اِرادہ کُن
مری ہر التجا نجات ، مدد

میرے ماں باپ سے شفیق احساس
میری کچھ ہیں گُزارشات مدد

روزِ روشن مری پناہ کے دن
اے مری عافیت کی رات مدد

منحصر ہے ، ترے ارادے پر
مری بخشش مری برات ، مدد

تیری جانب نگاہ اُٹھتی ہے
پھیل جاتے ہیں میرے ہاتھ ، مدد

میرے اندر بہت اندھیرا ہے
میرے اندر بھی ایک جھات ، مدد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نعتؐ

ہر روز نکلتا ہوں مدینے کے سفر پر
مُجھ کو مرے احباب نہ ڈُھونڈیں مرے گھر پر

اِک شخص کو دیکھا نہیں پر ذِکر پہ اُس کے
اِک اشک دمکتا ہے مرے تارِ نظر پر

میں ناقۂ ہجرت ہوں مدینے میں مِلوں گا
لادے ہوئے اَسبابِ محبت ہوں کمر پر

اُس کُوچۂ اَنوار میں لے آئی ہے حیرت
اسرار بھی کُھل جائیں گے اِس دیدۂ تر پر

ماں باپ نے خود اپنی وَراثت مجھے دی ہے
اور چھوڑ گئے ہیں شہِ کونین کے دَر پر

میں شہرِ محبت میں جو پہنچا تو مری آنکھ
کچھ ڈُھونڈتی پھرتی تھی ہر اِک راہ گزر پر

اُس بارگہِ عشق میں آنسو نہیں رُکتے
اِک ہاتھ ہے دِل پر ، تو ہے اِک ہاتھ جِگر پر

طاہرؔ میں گُنہ گار ہوں ، مومِن نہیں ، لیکِن
اِک ہاتھ کسی کا ہے مرے دستِ ہُنر پر

●

سخت مُشکل میں ہوں، اک خواہشِ سادہ کر کے
توڑ بیٹھا ہوں کئی بار اِرادہ کر کے

مَیں جسے اپنی محبت کی اکائی سمجھا
اُس نے تو چھوڑ دیا ہے مجھے آدھا کر کے

اُس کی باتوں کے بھروسے پہ کہاں تک جائیں !
وہ تو پورا نہیں کرتا کوئی وعدہ کر کے

وہ تو چُپ چاپ اُتر آتا ہے دل میں میرے
میں اُسے یاد نہیں کرتا اِرادہ کر کے

وہ جو اِک شخص مری مُٹّھی میں آ جاتا تھا
کھو دِیا مَیں نے اُسے دِل کو کُشادہ کر کے

مَیں بھی کیا نقش ہُوں اَزبر نہیں ہونے پاتا
اور وہ بُھول بھی جاتا ہے اِعادہ کر کے

کُچھ تکلّف بھی ضروری ہے رچاؤ کے لیے
زندگی اور بھی مشکل ہوئی سادہ کر کے

مَیں تو شہپر تھا ، ہواؤں میں اُڑا کرتا تھا
شوقِ شطرنج نے مارا ہے پیادہ کر کے

پہلے کاٹا مجھے اک پیڑ کے پہلو سے سلیمؔ
پھر اُڑایا ہے ہواؤں میں برادہ کر کے

●

فاصلہ کتنا ہے بَرفاب کا اور پانی کا
مسئلہ حل نہ ہوا آنکھ کی حیرانی کا

یہ نمُائش تو تجسّس کو ہوا دیتی ہے
چہرہ ہوتا ہے پسِ پردہ بھی عُریانی کا

اے مرے چاند! نکل آ کبھی تاریکی سے
آنکھ کب دیکھے گی منظر تری تابانی کا

چوب ِ سلطانی بھی دیمک زدہ ہو جاتی ہے
دِل تمنائی نہیں تختِ سلیمانی کا

اُس کا کہنا ہے کہ وہ پیاس سے مر جائے گا
مجھ سے اک شخص نے پوچھا ہے پتا پانی کا

حل تو ہر عُقدے کا اِک روز نکل آتا ہے
دائرہ پھیلتا جاتا ہے پریشانی کا

اب تو اپنی بھی کسی بات پہ چونک اُٹھتا ہوں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے نِگرانی کا

میری حالت پہ بھی اٹھے تری دُزدیدہ نظر
مستحق ہوں مَیں رعایت کا ، نظرِثانی کا

اُس نے چپ چاپ ہتھیلی پہ نگاہیں رکھ دیں
ہاتھ کچھ اس طرح پھیلا مری ویرانی کا

فاصلہ کم نہ ہوا دونوں کے مابین سلیمؔ
عقل نے ہاتھ نہ تھاما مری نادانی کا

●

اِس تکلُّف میں ترے ہوش ٹھکانے لگ جائیں
مجھ تک آتے ہوئے جا! تجھ کو زمانے لگ جائیں

ہر دو صورت میں تو نقصان ہمارا ہی ہے
دل کریں سینہ سِپر، سر کو بچانے لگ جائیں

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کے منہ تکتے رہیں
کیوں تعارض نہ کریں رنج اُٹھانے لگ جائیں

عمر بھر ہم نے کیا جِس کی محبت سے گُریز
اُس سے کیا عِشق کریں! خاک کمانے لگ جائیں

تم تو کہتے ہو کہ ہم ضبط کے قابِل نہ رہیں
ہم کو اس عمر میں کچھ روگ پُرانے لگ جائیں

تُو جو اِک بار کہیں حوصلہ اَفزائی کرے
ہم ترے کاندھے سے رونے کے بہانے لگے جائیں

ربط کی سُوکھی ہوئی شاخ ہری ہو جائے
پھول کِھل اُٹھیں ترے لَمس سے دانے لگ جائیں

کیا ضروری ہے کہ ہم روز ترا ذِکر کریں
دل جو اُجڑا ہے تو کیا شہر بسانے لگ جائیں

جھوٹ اِس عُمر میں بولا نہیں جاتا ہم سے
اپنے آئینے سے کیا چہرہ چھپانے لگ جائیں

تنگدستی مجھے رکھواتی ہے روزہ ، ہر روز
میرے اعضا مرے اعصاب نہ کھانے لگ جائیں

تم کو جانا ہے ، تو پھر ،عید تو ملتے جاؤ
کتنے دِن لوٹ کے آنے میں ،نہ جانے لگ جائیں

جب اُسے چھوڑ دِیا ، چھوڑ دِیا ، چھوڑ دِیا
اب کوئی پوچھے توکیا عُذر بتانے لگ جائیں

●

سُورج چلا جاتا ہے ، اُجالے نہیں جاتے
کچھ لوگ کبھی دل سے نِکالے نہیں جاتے

پلکوں کی مُنڈیروں پہ اُتر آتے ہیں چُپ چاپ
غم ایسے پرندے ہیں ، جو پالے نہیں جاتے

جب تھا ، تو بہت پُختہ تھا اک شخص سے رِشتہ
ٹوٹا ہے ، تو اب ٹکڑے سنبھالے نہیں جاتے

لوگوں کی تو فریاد پہنچتی ہے فلک تک
تجھ تک مری آہیں ، مرے نالے نہیں جاتے

کچھ لوگوں کی ہر دور میں پڑتی ہے ضرورت
جو کام ضروری ہوں! وہ ٹالے نہیں جاتے

اَب تک تری دُزدیدہ نگاہی کے ہیں چرچے
اب تک تری آنکھوں کے حوالے نہیں جاتے

اب تک وہی منظر ہے سرِ راہِ تمنّا
تاریکی میں ہمراہ اُجالے نہیں جاتے

جِس دن سے نگاہوں پہ ترا رستہ کُھلا ہے
اُس دن سے مرے پیروں کے چھالے نہیں جاتے

لوگوں نے تو لکھ لکھ کے سیہ کر دِیے دفتر
ہم سے تو یہ دو شعر نکالے نہیں جاتے

●

شوق اس عمر میں بھی ہیں مرے بچوں والے
ڈُھونڈتا رہتا ہوں گلیوں میں کھلونوں والے

تکتا رہتا ہوں میں تصویر بنا کر اُس کی
دیر تک ہاتھ نہیں دَھوتا میں رنگوں والے

ہم پراگندہ طبیعت بھی مُعَطّر ہو جائیں
ہم کو بھی پاس بٹھا لے کبھی پھولوں والے

یہ جو جگنو ہے ، بغاوت ہے اندھیرے کے خلاف
اپنا دم سادھ کے بیٹھے ہیں چراغوں والے

ہم تو اندھے ہیں دکھائی نہیں دیتا ہمیں کچھ
دیکھ کر کیوں نہیں چلتے یہاں آنکھوں والے

بیٹھ کر سُونی منڈیروں پہ فلک دیکھتا ہوں
حوصلے پَست ہوئے مجھ میں پرندوں والے

اُس نے مجھ کو کسی دیوار میں چُن دینا تھا
میں محل گر نہ گرا دیتا یہ خوابوں والے

نیند آتی ہے کہاں ہجر کے نخچیروں کو
تاک میں رہتے ہیں غم تیر کمانوں والے

نیم مُردہ ہے مرے جسم کے اندر کوئی چیز
قہقہے پھر بھی لگاتا ہوں میں زِندوں والے

●

کُوزے میں آب ،خاک میں دانہ تو ہے نہیں
پھر بھی یہ شہر چھوڑ کے جانا تو ہے نہیں

میں نے تو خود کو تیرے تصرّف میں دے دیا
اب میری دسترس میں زمانہ تو ہے نہیں

سچ بول کر ہی دیکھ لوں شاید وہ مان جائے
اُس نے مرے فریب میں آنا تو ہے نہیں

جی چاہتا ہے میں تجھے چُھو کر بھی دیکھ لوں
مَیں نے تیرے جمال کو کھانا تو ہے نہیں

بارش کو ناچتے ہوئے دیکھا ہے دھوپ میں
اِس عاشقی کا کوئی زمانہ تو ہے نہیں

یہ دِل ترے سُلوک پر اب روٹھتا نہیں
یہ جانتا ہے تُو نے منانا تو ہے نہیں

بیٹھا رہوں گا چُھپ کے اندھیرے کی آنکھ میں
مَیں نے کوئی چراغ جلانا تو ہے نہیں

ناپیں گے سوتے جاگتے طول ِ شب ِ فراق
تم نے ہمارے خواب میں آنا تو ہے نہیں

ہم خار و خس ازل ہی سے خانہ بدوش ہیں
آوارگی کا کوئی ٹھکانا تو ہے نہیں

دھوتے ہیں اشک روز پرانے نوادرات
آنکھوں کے پاس اور خزانہ تو ہے نہیں

●

کل شب غزل پڑی رہی پاؤں پسار کر
کاغذ پہ اُس نے رکھ دیے گہنے اُتار کر

آتے ہی بے رُخی ملی مجھ کو تپاک سے
کہنے لگی میں آ گئی عِدّت گزار کر

موسم نے دن نکلتے ہی چولا بدل لیا
کھڑکی میں آ کھڑا ہوا زلفیں سنوار کر

تسبیحِ یادِ یار کے دانے بکھر گئے
اب انگلیوں پہ رات کو تارے شمار کر

آنکھوں میں جم گئی تھی کئی ہجرتوں کی خاک
خود میں نے اشک پی لئے پانی نتھار کر

جو کچھ بھی میری جیب میں تھا نقد دے چکا
کچھ اور چاہتا ہے ، تو مجھ سے اُدھار کر

دریا ہے تُو، تو قطرے کے اندر سمٹ کے بیٹھ
محدود ہے اگر ، تو مجھے بے کنار کر

مجھ کو مرے غنیم کی صورت دِکھائی دے
اُس سے کہو کہ آنکھ مری واگُزار کر

●

اگرچہ شاد ہیں ، ناشاد بھی ہو جائیں تو کیا
تری خاطر جو ہم برباد بھی ہو جائیں تو کیا

جسے پڑھنا نہیں آتی نگاہوں کی عبارت
اُسے سارے صحیفے یاد بھی ہو جائیں تو کیا

قفس کی چار دیواری میں اب میں مُطمئِن ہوں
حوادِث صاحبِ اولاد بھی ہو جائیں تو کیا

مُجھے کرنا پڑے گی اپنے مِصرعے کی تِلاوت
سبھی شاعر مرے اُستاد بھی ہو جائیں تو کیا

پروں میں اب کوئی پرواز کی خواہش نہیں ہے
پرندے قید سے آزاد بھی ہو جائیں تو کیا

درِ حسنِ سماعت پر کوئی دستک نہیں ہے
سراپا ہم لبِ فریاد بھی ہو جائیں تو کیا

جب اپنی دید سے محروم ہم کو کر دیا ہے
تمھاری داد سے بے داد بھی ہو جائیں تو کیا

بدلنا ہے اگر حالات کی صورت بدل جائے
جو راضی ہیں بھلے ناشاد بھی ہو جائیں تو کیا

غنیمت ہیں ، مرے چاروں طرف سُنسان گلیاں
یہ میرے بعد گر آباد بھی ہو جائیں تو کیا

اُسی کے ہاتھ میں طاہر! شِفائے دردِ دِل ہے
دوائیں زائدالمیعاد بھی ہو جائیں تو کیا

●

دریا تھا ، مگر ایسی روانی میں نہیں تھا
خود سر میں کبھی اتنا جوانی میں نہیں تھا

ہر واقعہ موقوف تھا میری تگ و دَو پر
لیکن مرا کِردار کہانی میں نہیں تھا

رسوائی نے قیمت مری کچھ اور بڑھا دی
مہنگا میں کبھی اتنا گِرانی میں نہیں تھا

میں شہر کی دیوار سے لگ کر نہیں بیٹھا
رُکنا تو مری نقل مکانی میں نہیں تھا

خاموشی کی ہر رمز سے واقف تھا مرا ظرف
مشّاق ، مگر چرب زبانی میں نہیں تھا

کیوں تلخ ہوا ہے یہ مرا لہجۂ شیریں !
اتنا تو نمک آنکھ کے پانی میں نہیں تھا

●

دُکھ ہوتا ہے دُکھ ، کم یا زیادہ نہیں ہوتا
رو پڑتے ہیں ، رونے کا اِرادہ نہیں ہوتا

بس ٹوٹ کے رہتا ہے تعلق ہو کہ شے ہو
کوشش بھی کریں پھر بھی اعادہ نہیں ہوتا

کچھ لوگوں کی مُٹھی میں بھی رہ سکتا ہے انسان
کچھ لوگوں کا دِل اِتنا کُشادہ نہیں ہوتا

جس نے اِسے بھگتا ہو اُسی سے ذرا پوچھو!
یہ ہجر میاں! اتنا بھی سادہ نہیں ہوتا

بازار میں بدعہد کی قیمت نہیں رہتی
وعدہ جو نہ پورا ہو ، وہ وعدہ نہیں ہوتا

رونے کے لیے ڈھونڈنا پڑتا ہے بہانہ
کچھ باتوں کا دُکھ اِتنا زیادہ نہیں ہوتا

خود سامنے آ جاتے ہیں برجستہ نکل کر
جذبات کے تن پر تو لبادہ نہیں ہوتا

وہ لوگ بھی مِل جاتے ہیں اکثر سرِ بازار
جن لوگوں سے ملنے کا اِرادہ نہیں ہوتا

●

مکان رہتے ہیں خاموش گھر نہیں کُھلتے
کئی مکینوں پہ دِیوار و دَر نہیں کُھلتے

عجیب لوگ ہیں، چُپ چاپ چلتے رہتے ہیں
تمام عمر کئی ہم سفر نہیں کُھلتے

بہت سے لوگوں کو اپنا پتا نہیں چلتا
بہت سے لوگوں پہ اپنے ہُنر نہیں کُھلتے

نظر کی زد میں کُھلا آسمان ہوتا ہے
ہزار مرتبہ اُڑنے کو پر نہیں کُھلتے

سمٹ کے رہتے ہیں کمروں کے کونوں کھدروں میں
خود اپنے آپ پہ اندر کے ڈر نہیں کُھلتے

بہت سے لوگوں کے ماتھے پہ لکھا ہوتا ہے
ہر ایک ہاتھ کی دَستک پہ در نہیں کُھلتے

بہت سے خواب نگاہوں میں بند رہتے ہیں
بہت سے خواب مری چشم تر نہیں کُھلتے

پھر اپنی بے بسی بنتی ہے خُود تماشائی
جو سر پہ آن پڑے زور و زر نہیں کُھلتے

نظر کی بات کو دل سے چھپاتے رہتے ہیں
خود اپنے آپ پہ کچھ دیدہ ور نہیں کُھلتے

بڑے بڑوں کا بھرم گفتگو میں کُھلتا ہے!
اسی لیے تو کئی مُعتبر نہیں کُھلتے

●

جو آسمان ہے یہ کون سارا مانگتا ہے
یہ دل تو تم سے فقط اِک ستارا مانگتا ہے

میں چاہتا ہوں سہولت سے سانس لے پاؤں
اُسے گماں ہے ہوا پر اجارا مانگتا ہے

یہ بے سبب نہیں اُٹھتی نگاہ تیری طرف
جو شخص ڈُوب رہا ہو کنارا مانگتا ہے

مری نظر میں نہیں کنجیاں خزانے کی
ترا فقیر تو تجھ سے گزارا مانگتا ہے

جو ضَرب دیتا ہے ، تقسِیم کر نہیں سکتا
جو پیار کرتا ہے دل پر اِجارا مانگتا ہے

مری سَمجھ میں تو آتا نہیں جواب کوئی
وہ راہگیر ہے اور دِل ہمارا مانگتا ہے

تمھاری رہ کا مسافر جھلس نہ جائے کہیں
یہ تیز دھوپ میں اِک اَبر پارا مانگتا ہے

یہ ہجر ہے ہمیں اندر سے کھاتا رہتا ہے
یہ عِشُق زَاد ہے یہ سر ہمارا مانگتا ہے

گرِفتہ دِل نے کبھی منفعت نہیں چاہی
یہ کام ایسا ہے منھ سے خسارا مانگتا ہے

●

جانے کیا فرق ہے جینے میں ، جئے جانے میں
زندگی ہم نے گزارا تجھے ہرجانے میں

اب طلب ہے نہ کوئی حسنِ طلب باقی ہے
اب تو کل کی بھی پڑی رہتی ہے پیمانے میں

کوئی چلتا ہے سرِ شام یہاں بندہ نواز
پہلے کب پھول کوئی کھِلتا تھا ویرانے میں

یہ تو ہم خود ہی نہیں چاہتے اچھے ہو جائیں
ورنہ آسانی تو ہے زخم کے بھر جانے میں

تار سے تار جدا کرنا ہے کارے دارد
فائدہ کیا ہے کسی بات کو اُلجھانے میں

کرنا پڑتی ہیں فقط لکڑیاں آگے پیچھے
دیر کب لگتی ہے اب آگ کے بھڑکانے میں!

تجھ کو معلوم نہیں ہے کہ تماشا کیا ہے
لطف کیا ہے ترے کُوچے کی ہوا کھانے میں

ہم اُدھر جا کے ، نظر بھر کے اُسے دیکھتے ہیں
اور مزہ لیتے ہیں منظر کو اُٹھا لانے میں

خود بخود اب تو نِکل آتے ہیں ہر بات کے پر
اب ہوا کی بھی ضرورت نہیں پھیلانے میں

بیٹھا رہتا ہے ترے قریۂ سرسبز میں دِل
اب تصوّر میں بھی جاتا نہیں ویرانے میں

●

بنیاد ڈال دی ہے تو دیوار و در نِکال
اے خواہشِ جنُوں مرے اندر سے سر نِکال

میں نے تو اپنی پوٹلی رکھ دی زمین پر
اب تُو بھی اپنی جیب سے دستِ ہُنَر نِکال

اُس کو طلب نہیں تو نُمائش سے فائدہ
مت اشک اُس کے سامنے اے چشمِ تر نِکال

کہتی ہے آسمان کی وُسعت پکار کر
اے نیل کنٹھ ! نیند کی بُکّل سے سر نِکال

مجھ کو بھی اشتیاق ہے اُونچی اُڑان کا
کچھ دن کے واسطے تُو مرے بال و پَر نِکال

بچھڑے ہوؤں میں رابطہ پھر سے بحال ہو
حیرت اُچھل پڑے کوئی ایسی خبر نِکال

صدیوں سے بے خبر ہوں میں اپنے وجود سے
میری طرف بھی اپنی کوئی رہ گزر نِکال

میری کسی بھی بات کے مطلب نہیں ہیں دو
یوں ہی نہ ڈُھونڈ ڈَھانڈ کے زیر و زبر نِکال

کب تک رہوں گا صرف کھلونوں سے کھیلتا
مٹّی سے کوئی گھر بھی مرے کوزہ گر نِکال

●

نقدِ جاں جیب میں رکھ ، عشق اُدھارے پہ چلا
اس گِرانی میں دُکاں اپنی خسارے پہ چلا

عمر بھر میرے کہیں پاؤں نہ ٹکنے پائے
میں تو اِک ایک قدم کانپتے پارے پہ چلا

چاند کو جلد کسی سمت چلے جانا تھا
میں تو پھر جتنا چلا ، ایک ستارے پہ چلا

اُس کی آنکھوں کی ہر اک سمت عملداری تھی
اپنا دم سادھ کے میں اُن کے اشارے پہ چلا

کس اذیّت سے گزرتی ہے تمھیں کیا معلوم
روح کو چھید ، بدن آہنی آرے پہ چلا

ہنس کے مت بول ، مگر ایک نظر دیکھ تو لے
جب بھی دل چاہے ترا ، حکم ہمارے پہ چلا

وہ تو دریا تھا ، اُسے بہنا تھا اپنی رَو میں
اپنی رفتار سے میں ساتھ کنارے پہ چلا

آتشِ عشق کبھی سرد نہ ہونے پائی
عمر بھر میں تو محبت کے شرارے پہ چلا

سیدھے رستے پہ بھی چلنا نہیں آتا تھا مجھے
ڈوبتا ، تیرتا میں وقت کے دھارے پہ چلا

کون اس عمر میں باتوں کا برا مانتا ہے
تیری مرضی ہے نبھا یا ہمیں لارے پہ چلا

●

نہ جانے کیسے تری دسترس میں آ گیا تھا
ہوا میں اُڑتا پرندہ قفس میں آ گیا تھا

ترا خیال نہ جانے کہاں سے دَر آیا
وگرنہ صبر تو اتنے برس میں آ گیا تھا

پھر اُس نے مجھ کو کوئی بات ہی نہ کرنے دی
میں بات کرتے ہوئے پیش و پَس میں آ گیا تھا

تمھارے نام پہ اِک جلترنگ بجتا تھا
ہوا کا زمزمہ تارِنفس میں آ گیا تھا

میں دست بُردِ زمانہ سے بچ نہیں پایا
مرا ضمیر بھی دامِ ہوس میں آ گیا تھا

ترے شمال میں اڑتا تھا میں ہوا کی طرح
ترے جنوب میں رخنہ فرس میں آگیا تھا

بگولا بن کے میں پھرتا تھا چشمِ صحرا میں
کوئی غرور مرے خار و خَس میں آگیا تھا

●

اِک تہجّد گُذار تنہائی
ہے مری یارِ غار تنہائی

اِک ملاقات اور اُس کے بعد
ان گِنَت ، بے شمار تنہائی

وہ تجھے یاد کر کے روتا رہے
اُس کے اندر اتار تنہائی

رونقیں نقد لے گیا ہے کون
دے گیا ہے اُدھار تنہائی

اُس کے ملنے کا گرم گرم احساس
اور پھر ٹھنڈی ٹھار تنہائی

گھر کے باہر ہے ایک سنّاٹا
گھر کے اندر ہزار تنہائی

زندگی کس طرح گزارتے ہیں
جن کے ہے آر پار تنہائی

مجھ سے اوقات ِ کار پوچھتی ہے
رات ، دِن بار بار تنہائی

بُجھ رہا ہے چراغ جلتا ہوا
ہائے! بے اختیار تنہائی

وصل ، اب کس طرح سمیٹے گا
ہجر کی بے کَنار تنہائی

آنکھ سے رفتہ ، رفتہ پھوٹتی ہے
دانہ ، دانہ انار تنہائی

ہجر کا لمحہ میرے ہاتھ میں ہے
مستقل اِنتظار تنہائی

جسم میں پنجے گاڑ دیتی ہے
رات بھر خار دار تنہائی

ملنے والوں کے پاس وقت نہیں
سر جھٹک کر گُذار تنہائی

وقت بے رحم ہو تو کاڑھتا ہے
بخیہ گر تار تار تنہائی

چھید دیتی ہے روح کی چادر
بے بصر تیز دھار تنہائی

●

صُبح دَم جاگتے ہیں آئینے
شاخ پر پُھوٹتے ہیں آئینے

ہم نے اُس عمر میں تمھیں دیکھا
جِس میں سب دیکھتے ہیں آئینے

عکس میں جب دَراڑ پڑ جائے
خود بخود ٹُوٹتے ہیں آئینے

جب اندھیرا طواف کرتا ہے
رات بھر گُونجتے ہیں آئینے

اب کوئی اُن کو دیکھتا بھی نہیں
اپنا مُنہ دیکھتے ہیں آئینے

بے وجہ دل پسیج جاتا ہے
بے وجہ پُھوٹتے ہیں آئینے

اپنے چہروں کو دیکھ کر اکثر
ہاتھ سے چُھوٹتے ہیں آئینے

اُن کو آتا ہے دَم بخُود کرنا
پھر کہاں بولتے ہیں آئینے

جب کبھی دِل اُداس ہوتا ہے
حالِ دِل پُوچھتے ہیں آئینے

●

یہ جو اک چاند ہے سِتارہ ہے
اس پہ کیا کوئی حق ہمارا ہے

اک جگہ پر نہیں ٹھہرتا جنوں
عشق پارے کا استعارہ ہے

بدگمانی نکالتی ہے ہوا
دل تو جذبات کا غبارہ ہے

اُنگلیاں اُٹھ رہی ہیں میری طرف
آپ کا کِس طرف اشارہ ہے

وہ یقیناً معاف کر دے گا
یہ مرا حسنِ استعارہ ہے

مرے کانوں میں گونجتا ہے کون
کس نے بے ساختہ پکارا ہے

آپ سرشار ہیں رعونت سے
دل مرا عجز کا سپارہ ہے

تم کو شاید کبھی پتا نہ چلے
میں نے دن کس طرح گزارا ہے

●

محبت زنگ آلُودہ کڑی ہے
مگر زنجیر کے دِل میں پڑی ہے

مری تصویر واپس بھیج دینا
تمھاری آنکھ کے اندر پڑی ہے

نکل کر دیکھ لے میری اُداسی
تری دہلیز کے باہر کھڑی ہے

میں دن بھر کس کا رستہ دیکھتا ہوں
کلائی پر مرے کس کی گھڑی ہے

اندھیرے میں چمک اُٹھتی ہیں آنکھیں
محبت پھول ہے یا پھلجھڑی ہے

ابھی تک میں مَوقِف پر ڈٹا ہوں
ابھی تک اپنی ضِد پر وہ اڑی ہے

گھروں کے بند دروازے ہیں لرزاں
دِلوں میں خوف ہے اِک بھگدڑی ہے

میں سودا بیچتا پھرتا ہوں کس کا
مرے سر پر یہ کس کی چھابڑی ہے

کسی کا غم ہو رو پڑتی ہیں آنکھیں
بِنا ساون کے ساون کی جھڑی ہے

●

تیرے ہوتے ہوئے یہ میرا نہ ہونا کیا ہے
یہ مرا دِل ہے کہ ہے کوئی کِھلونا کیا ہے

اپنی مرضی سے میں اُس شکل پہ برباد ہوا
میں اگر خوش تھا ، تو پھر میرا یہ رونا کیا ہے

ایک کونہ تری دنیا کا پکڑ بیٹھا ہوں
اور اس سوچ میں ہوں دوسرا کونا کیا ہے

وہ جو اِک لمحہ مرے ہاتھ سے نکلا ہے ، تو بس!
اب مرے ہاتھ میں کیا ہے ؟مجھے کھونا کیا ہے

جانے کس جرم کے احساس کو چُھو بیٹھا ہوں
ہاتھ پر میل نہیں ہے تو یہ دھونا کیا ہے

اپنے بستر پہ پڑے دیکھتے رہنا چھت کو
آنکھ کا جاگنا اور جسم کا سونا کیا ہے

ہاتھ میں ہاتھ ہے اِک شخص کا چاندی جیسا
ساری دنیا کا مری آنکھ میں سونا کیا ہے

کب نکلتا ہے نتیجہ کسی خوش فہمی کا
ایک پتھر میں کسی بیج کا بونا کیا ہے

بدگمانی کو اُٹھائے نہیں پھرتے سر پر
دِل نہ چاہے تو کسی بوجھ کا ڈھونا کیا ہے

●

کوئی بھی ربط خدا کی قسم نہیں رکھا
پھر اُس کے شہر میں ہم نے قدم نہیں رکھا

جِگر کے خوں سے جَلایا بُجھے چراغوں کو
بُجھا کے طاق پہ غیروں کا غم نہیں رکھا

اُٹھا کے اُس کے تصرّف میں دے دیا سب کچھ
اور اپنے واسطے کچھ بیش و کم نہیں رکھا

یہ اور بات وہ ہم سے عناد رکھتا ہے
یہ اور بات کہ ہم نے بھرم نہیں رکھا

مرے خیال کی پوروں سے رِس رہا ہے لہو
شکستہ ہاتھ سے ، لیکن قلم نہیں رکھا

کسی نے مجھ میں نئی روح پھونک دی ہے سلیم !
فقط ہوا کے بھروسے پہ دم نہیں رکھا

●

سفر موقوف ہے اور قافلہ ٹھہرا ہوا ہے
تھکن کے شہر میں اِک رتجگا ٹھہرا ہوا ہے

جو کایاں تھے ترے تیور سمجھ کر جا چکے ہیں
یہ دِل معصوم ہے ، یہ باؤلا ٹھہرا ہوا ہے

بس اِک تشویش پھرتی ہے نظر میں بال کھولے
میں سرگرداں ہوں لیکن حوصلہ ٹھہرا ہوا ہے

ہوا جلتے چراغوں کو بجھانے پر مُصر ہے
جو ہونے جا رہا تھا حادثہ ، ٹھہرا ہوا ہے

کسی اُمید کی کوئی کرن روکے کھڑی ہے
اِرادے جا چکے ہیں ، نقشِ پا ٹھہرا ہوا ہے

مری جانب توجہ ہو تمھاری تو کہوں کچھ
لبوں پر ایک حرفِ مدعا ٹھہرا ہوا ہے

مری آواز مجھ تک کیوں پلٹ کر آ رہی ہے
مرے رستے میں کیا کوہِ ندا ٹھہرا ہوا ہے

جسے جانا تھا اک مدّت سے اُٹھ کر جا چکا ہے
یہاں ٹھہرا ہے جو بے دست و پا ٹھہرا ہوا ہے

لپیٹا جا چکا ہے کب کا دسترخوان طاہر
زباں پر گفتگو کا ذائقہ ٹھہرا ہوا ہے

●

گردشِ وقت یہ خاشاک اُٹھا کر لے جا
شیشۂ جاں پہ جمی خاک اٹھا کر لے جا

یہ مرا خاک بدن ، خاک بہ سر رہنے دے
کُوزہ گر مان بھی جا ، چاک اٹھا کر لے جا

اور تو کچھ بھی ترے ہاتھ نہیں آنے کا
آ یہی دامنِ صد چاک! اٹھا کر لے جا

پہلے تو سر کو اُٹھا ، آنکھ اُٹھا ، حشر اُٹھا
پھر ہو مقدور تو افلاک اٹھا کر لے جا

میں بھی جی لوں کسی معصوم سے بچے کی طرح
مری وحشت ، مرا اِدراک اٹھا کر لے جا

اور تو سارے سِتم تیرے گوارا ہیں مگر
اپنا یہ لہجۂ بے باک اٹھا کر لے جا

اب تو ہر بات ترے منہ پہ میں کہہ سکتا ہوں
دھونس اپنی میرے سفّاک اٹھا کر لے جا

اب کبھی میں ترے جھانسے میں نہیں آؤں گا
جال اپنا مرے چالاک ، اٹھا کر لے جا

دو قدم ساتھ چلا ہوں تو کھلا تیرا فریب
میری جاں بخش دے ، فتراک اٹھا کر لے جا

تُو تو مجھ کو کسی خاطر میں نہیں لاتا تھا
اپنے ملبے سے مری دَھاک اٹھا کر لے جا

●

بدگمانی کی بھی آخر کوئی حد ہے ، حد ہے
اپنی صورت سے بھی اب مجھ کو حسد ہے، حد ہے

مجھ کو خود بارِ ندامت نہیں اُٹھنے دیتا
اِس پہ جو طنز و ملامت ہے یہ رَد ہے، حد ہے

میری تائید کے تابع ہیں مرے ہوش و حواس
ایک مُٹھی میں جنوں اِک میں خِرد ہے، حد ہے

میرے ہونے کی نہ ہونے کی ضمانت ہی نہیں
میرے چہرے پہ کوئی خال نہ خَد ہے، حد ہے

تو نے جب مجھ سے تعلق کی نفی کر دی ہے
تیرا کہہ دینا ہی کافی ہے ، سند ہے، حد ہے

رات دن تیری خوشامد میں لگا رہتا ہوں
باوجود اس کے مری ذات سے کدّ ، حد ہے

مُستعد رہنے کی کوشش تو بہت کرتا ہوں
میری ہمّت ہی مری راہ کی سَدّ ہے ، حد ہے

سَرو قد لوگوں کو تکتا ہوں اُٹھا کر سر کو
مجھ کو لگتا ہی نہیں میرا بھی قد ہے ، حد ہے

دو دِلوں میں نہیں ثالث کی ضرورت طاہر
یہ جو اِک تین کا ہندسہ ہے ، عدد ہے ، حد ہے

●

بہت سے فیصلے اپنے خلاف کرتے ہوئے
میں تھک گیا ہوں انا میں شگاف کرتے ہوئے

نہ جانے کون مرے جیسا مجھ کو دیکھتا ہے
میں ڈرتا رہتا ہوں آئینہ صاف کرتے ہوئے

میں اب کسی سے بھی لڑتا نہیں ، جھگڑتا نہیں
میں اب تو ہنستا بھی ہوں اِختلاف کرتے ہوئے

وہ اپنے دل میں مجھے راز رکھنا چاہتا تھا
وہ رو پڑا تھا مرا اِنکشاف کرتے ہوئے

میں آ رہا تھا رَعُونت کو مار کر پتھر
میں رو رہا تھا مسلسل طواف کرتے ہوئے

پھر ایک بار اذیّت مرے مقابل تھی
پھر ایک بار عدو کو معاف کرتے ہوئے

یہ سوچتا ہوں کہ اب کیسے واپسی ہو گی
کہاں پہنچ گیا میں اِنحراف کرتے ہوئے

نہ جانے کس کو ضرورت ہے میری روشنی کی
کہاں پہنچتی ہے یہ اِنعطاف کرتے ہوئے

پھر اُس کی اپنی نگاہوں سے ضبط بہہ نکلا
وہ کُھل گیا زَرِ نیّت غلاف کرتے ہوئے

یہ کس کو چُھونے سے پوروں پہ جم گئی ہے گرد
کہ چِھل گئے ہیں مرے ہاتھ صاف کرتے ہوئے

وہ جانتا تھا میں اُس کو معاف کر دوں گا
وہ مطمئن تھا بہت اِعتراف کرتے ہوئے

ذرا سی برف بھی رکھ لی ہے میں نے پہلو میں
ٹھٹھرتے جسم کے اوپر لحاف کرتے ہوئے

●

منھ سے میرے نہیں نکلا کبھی آہا آہا
ہاں ، مگر میں نے تجھے ٹوٹ کے چاہا آہا

زخم بخشے ہیں تری یاد کی سسکاری نے
رکھ دے ہونٹوں پہ کوئی پھول سا پھاہا آہا

اپنی اک آنکھ مرے حالِ دلِ زار پہ رکھ
واقفِ حال مرے چور نگاہا آہا

اکثر اوقات مرے دل نے دھڑکنا چھوڑا
بارہا تو نے مرے دِل کو تراہا آہا

میں نے کب تیری حِراست سے رہائی چاہی
میں ہوں محفوظ مرے شہر پناہا آہا

میں سمجھتا تھا کہ میں اُس کو بُھلا بیٹھا ہوں
درد سے دِل میرے سینے میں کراہا آہا

تُو تو واقف ہے مرے حال سے، احوال سے بھی
بَرملا کہہ دے کبھی میرے گواہا آہا

تو نے دنیا کو چکاچوند بنا رکھا ہے
دن کے سورج ، اے مری رات کے ماہا آہا

میں جو پڑھتا ہوں تو وہ مصرع اُٹھا لیتا ہے
بارہا اُس نے مرا شعر سراہا آہا

بیٹھ کر عمر کی دہلیز پہ کاتی ہے کپاس
قریۂ میرؔ کا ہوں ایک جولاہا آہا

تیرے لوگوں کی محبت مری پہچان بنی
مجھ پہ یہ تیرا کرم ہے مرے شاہا آہا

●

اُس کی آنکھیں یاد ہیں ، اُس کا چہرہ گُم
بس اتنا ہی حِفظ ہے باقی حافظہ گُم

وہ اِک نام ہی ازبر رہ گیا پوروں کو
دریا بُرد کتابیں ہو گئیں ، بَستہ گُم

آنکھیں مُوند کے کون خزانہ ڈھونڈتا ہے
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ، نقشہ گُم

رہتے رہتے رہ جاتا ہے ایک خیال
ہوتے ہوتے ہو جاتا ہے چہرہ گُم

ہم نادِیدہ چاند کو تکتے رہتے تھے
اِستغراق میں ہو گیا ایک ستارہ گُم

فرطِ شوق میں اُٹھے تھے دوچار قدم
اُس کے بعد ہوا تھا دشت میں قافلہ گُم

کوئی خواب میں انگلی تھام کے چلتا تھا
چلتے چلتے ہو جاتا تھا رابطہ گُم

دو دریا تھے ، باہم آڑ میں چلتے تھے
پھر اِک لہر نے کر دیا میٹھا ، کھارا گُم

ڈوبتے ڈوبتے پار اُترنے لگتے تھے
ہو جاتا تھا یک دم ایک کنارا گُم

●

دُکاں سے نقد اٹھا کر ادھار پھینکنا ہے
خود اپنی خاک اُڑا کر غُبار پھینکنا ہے

وہ اَسپِ تازی ، جو بھاگا ہے بے لگام ابھی
میں جانتا ہوں کہ اُس نے سوار پھینکنا ہے

اور اب تو منہ بھی لگاتا نہیں میں آئینے سے
کبھی تو خود پہ بھی غصّہ اُتار پھینکنا ہے

میں اب اٹھا نہیں سکتا تکلُّفات کا بوجھ
کلاہ و جُبّہ سرِ رہ گزار پھینکنا ہے

تم اپنا طرزِ تخاطب بدلتے جاتے ہو
مجھے بھی خود پہ جو ہے اختیار ، پھینکنا ہے

نیازمند ہوں ، تجھ تک ، مگر رسائی نہیں
یہیں کھڑے کھڑے پھولوں کا ہار پھینکنا ہے

وہ چاہتا ہے کہ فوراً ادائیگی ہو جائے
مگر مجھے تو یہ دِل قِسط وار پھینکنا ہے

عجب ہی کیا کہ محبت فروغ پا جائے
دِکھانا ایک ہے ، لیکن ہزار پھینکنا ہے

جسے بھی چاہیے حاجت بتا کے لے جائے
مجھے تو یوں بھی دِلِ داغ دار پھینکنا ہے

●

یہ جو دستِ شام پہ جل رہا ہے ستارا ایک چراغ سا
مجھے اُس کی آنکھ سے مل رہا ہے اشارہ ایک چراغ سا

میں جو تیرگی کے بھنور میں ہوں، کسی آگہی کے سفر میں ہوں
مجھے اپنی سمت بلا رہا ہے کنارہ ایک چراغ سا

مجھے آسمان کی آنکھ میں کسی روشنی کی تلاش تھی
کہیں غیب سے، کسی ہاتھ نے مجھے مارا ایک چراغ سا

کئی جگنوؤں سے چمک اٹھا شبِ انتظار میں راستہ
کسی کُنجِ لب سے سسک پڑا تھکا ہارا ایک چراغ سا

مرے جسم و جاں میں اتر گئی ترے اِتصال کی روشنی
ترے لمس نے مری تیرگی میں ابھارا ایک چراغ سا

شبِ تار شہرِ خمار میں کسی ماہتاب کی دھوم تھی
چڑھا دن تو میں نے فصیلِ شب سے اتارا ایک چراغ سا

مجھے اُس گلی سے فرار کا کوئی راستہ نہیں مل سکا
مری گُمرہی میں چمک اُٹھے کوئی چارہ ایک چراغ سا

تری گفتگو کی کتاب سے مرا ذکر کس طرح گم ہوا
کفِ مصلحت نے بجھا دیا ہے ہمارا ایک چراغ سا

ترے بعد میرے دیار میں کبھی روشنی نہیں ہو سکی
مجھے تیرگی میں بڑھا گیا ہے خسارہ ایک چراغ سا

کئی ناامید سی ساعتیں زرِ روشنی سے چمک اُٹھیں
کسی حوصلے نے لگا دیا کوئی نعرہ ایک چراغ سا

●

ہم نے جو وقت اندھیرے میں گزارا ہے میاں
روشنی پر یہی احسان ہمارا ہے میاں

رات بھر اُس نے ملائی ہے مری آنکھ سے آنکھ
وہ جو اک چاند کے پہلو میں ستارہ ہے میاں

کیا مری آنکھ پہ وہ ہاتھ نہیں رکھ سکتا
بے خیالی میں جسے میں نے پکارا ہے میاں

کیا وہ کچھ دور مرے ساتھ نہیں چل سکتا
اس کنارے سے اُدھر میرا کنارہ ہے میاں

کیا ستارے بھی زمیں زادوں کو تکتے ہوں گے
کیا ستاروں کی چمک کوئی اشارہ ہے میاں

اب کسی سمت نِکل جانے کو آزاد ہیں ہم
ہم نے چلتے ہوئے ہر بوجھ اُتارا ہے میاں

تیرے کچھ لوگ ہمیں رہنے نہیں دیتے یہاں
ورنہ یہ شہر تو اُتنا ہی ہمارا ہے میاں

یہ تو ہم لوگوں نے مُشکل سے دُکاں کھولی ہے
اب تو اِس عشق میں ہر طور خسارہ ہے میاں

قیس و فرہاد مرے ساتھ پڑھا کرتے تھے
مکتبِ عشق میں اک نام ہمارا ہے میاں

یہ تو ہم ہیں کہ ترے نام کئے بیٹھے ہیں
ویسے اس دل پہ بہت سوں کا اجارہ ہے میاں

تم نے آنگن کو گزرگاہ بنا ڈالا ہے
تم تو کہتے تھے کہ دل صرف تمہارا ہے میاں

بانجھ دھرتی کو فلک زاد بنا دیتا ہے
سبز پرچم پہ جو اک چاند ، ستارہ ہے میاں

جانے کس کس کی دُعاؤں سے بچے بیٹھے ہیں
بدنصیبی نے ہمیں ڈھونڈ کے مارا ہے میاں

جانتا ہوں کہ ، مری بات وہ رَد کر دے گا
اُس کی خدمت میں ہی درخواست دوبارہ ہے میاں

●

دیکھا نہیں تُجھ کو ، نظر آئی نہیں دُنیا
مجھ کو مری آنکھوں نے دکھائی نہیں دُنیا

یہ میرے بزرگوں کو وراثت میں ملی ہے
یہ میرے بزرگوں نے کمائی نہیں دنیا

بازو سے پکڑ کر مجھے کل روک لیا تھا
پھر میں نے بھی رستے سے ہٹائی نہیں دُنیا

بانہوں کے شکنجے میں جکڑ کر اسے رکھو
معشوق کی نازک سی کلائی نہیں دُنیا

بہتے ہوئے پانی کا ہر اک رنگ ہے اس میں
ٹھہرے ہوئے پانی پہ تو کائی نہیں دُنیا

دنیا نے رگیدا ہے مجھے جب بھی رگیدا
میرے کبھی چنگل میں تو آئی نہیں دُنیا

دنیا کی کوئی کَل مجھے سیدھی نہیں لگتی
انسان کے ہاتھوں نے بنائی نہیں دُنیا

کل تک میں سمجھتا تھا کہ دنیا ہے کوئی چیز
اب تک مری مٹھی میں تو آئی نہیں دُنیا

کھانے کا نمک خود ہی کمانا پڑا مجھ کو
روٹی سے لگا کر کبھی کھائی نہیں دُنیا

دَستک تو ہوئی ہے مرے دروازے پہ اَکثر
لیکن مرے اندر کبھی آئی نہیں دُنیا

●

ذرا سی دیر تو دِل میں ملال رہتا ہے
پھر اُس کے بعد تمہارا خیال رہتا ہے

جو تُجھ سے ملنے کی اُمید دِل میں رہتی ہے
ترے بچھڑنے کا بھی ، احتمال رہتا ہے

کسی جواب سے دِل مطمئن نہیں ہوتا
ہر اِک سوال کے پیچھے ، سوال رہتا ہے

تباہی اور کسی سمت سے نہیں آتی
ہر اِک عروج کی تہ میں زوال رہتا ہے

ہماری آنکھ میں جب کوئی آتا جاتا نہیں
تو پھر یہ راستہ ، کیوں پائمال رہتا ہے

ترے یقین کا آئینہ ، ٹوٹ سکتا ہے
اگر گمان کے شیشے میں بال رہتا ہے

فقط وصال کی پیشین گوئی ہوتی ہے
وگرنہ ، ہجر یہاں سارا سال رہتا ہے

●

خُوش فَہم تھا میں ، رَبط بڑھانے سے پیشتر
پَھل چاہتا تھا پیڑ لگانے سے پیشتر

میں نے بھی روکنے کا تکلُّف نہیں کیا
وہ جا چکا تھا ہاتھ چھڑانے سے پیشتر

پھر میں بھی اپنے اَشک چھپانے میں لگ گیا
وہ رَو پڑا تھا حال سُنانے سے پیشتر

پہلے میں دیر تک فقط آنکھیں بناتا ہوں
چہرے کے باقی نَقش بنانے سے پیشتر

مُشکل بہت تھا شہر سے ہجرت کا فیصلہ
جانا پڑا تھا جان سے جانے سے پیشتر

گیلی زمیں پہ پاؤں جمانا پڑے مجھے
اِک آسمان سَر پہ اُٹھانے سے پیشتر

چلنے لگا تو حوصلہ قدموں میں آ گِرا
میں تھک گیا قدم کو بڑھانے سے پیشتر

پھر اُس نے میرے شہر میں آ کر اَذان دی
خُطبہ پڑھا ، نماز پڑھانے سے پیشتر

سب در بہ در پھریں گے خَجِل، اِتنا سوچنا
بیٹھے ہوؤں کو دَر سے اُٹھانے سے پیشتر

آخر میں اُس نے مجھ سے مرے دِل کی بات کی
وہ کر چکا تھا بات زمانے سے پیشتر

میری زمین نے مرے پاؤں پکڑ لیے
میں رو پڑا تھا چاند پہ جَانے سے پیشتر

پھر میں نے اُس کو اَدھ کھلی بانہوں میں بھر لیا
وہ گِر پڑا تھا ہاتھ لگانے سے پیشتر

●

کون کہتا ہے کہ دُنیا مجھے خیرات میں دے
مجھ کو دینا ہے جو کچھ تو مری اوقات میں دے

تیرے ہمراہ چلوں ، دُور تلک بھیگتا جاؤں
ایک موقع مرے مالک مجھے برَسات میں دے

عُمر بھر تیری سخاوت نہیں بُھولے گی مجھے
جو بھی دینا ہے مجھے صدقۂ سادات میں دے

دیر تک یاد رہیں گی تری کڑوی باتیں
اب کوئی شہد سا لہجہ بھی ملاقات میں دے

میں نے کب تجھ سے کہا ہے کہ میں سب جانتا ہوں
کچھ رعایت تو مری جان سَوالات میں دے

آج تک دیکھ نہیں پایا تجھے غور سے میں
ایک بھرپور جَھلک مجھ کو عِنایات میں دے

مجھ کو حاجت ہی نہیں کچھ بھی ضرورت کے سوا
تابشِ حُسنِ قَناعت مری اَوقات میں دے

تو مرا ہاتھ پکڑتا بھی ، جَھٹکتا بھی نہیں
کوئی تَرتِیب تو بگڑی ہوئی عادات میں دے

یہ غزل ، نَظم ، قصیدہ تو سبھی کہتے ہیں
دسترس مجھ کو جو دینی ہے تو پھر نعت میں دے

●

پلٹ کے دیکھا جو میں نے تو تُو دِکھائی دِیا
پھر اُس کے بعد مجھے چارسُو دِکھائی دِیا

میں چُپ ہوا تو تری خامُشی مُخاطِب تھی
اور اِک جہان پسِ گفتگو دِکھائی دِیا

میں جِس کو دیکھ کے خُود راستہ بدلتا تھا
ٹھِٹھک گیا جو مرے رُو برُو دِکھائی دِیا

عجیب عجز ہے سجدے سے سر اُٹھاتا نہیں
غرُور جب سے مرا با وُضُو دِکھائی دِیا

وہ آئینے سے یقیناً یہ پُوچھتا ہو گا
مری طرح کا کوئی خوبرُو دِکھائی دِیا

ہر ایک راہ میں سنّاٹا احتجاج پہ تھا
اِک اِنتشار مگر کُو بہ کُو دِکھائی دِیا

وہ جِس کے رنگ مہکتے ہیں بات کرتے ہوئے
وہ آج بولا تو بے رنگ و بُو دِکھائی دِیا

مرے لئے تو تری یاد اِک ستارہ ہے
کبھی کبھی ہوا اوجھل کبھو دِکھائی دِیا

ترے لگائے ہوئے زخم اِس طرح سے سِیئے
کوئی کہے کہ کسی کو رُفو دِکھائی دِیا

وہ جب بھی میرے مقابل میں آیا ، جیت گیا
میں اُس سے ہار کے بھی سُرخرُو دِکھائی دِیا

مجھے تو پینے ، پلانے کا شوق تھا ہی نہیں
یہ میرے ہاتھ میں کس کا سبُو دکھائی دِیا

مرے ہی نام نہ لگ جائے میرا قتل سلیم
خود اپنے ہاتھ پہ ، مجھ کو لہو دِکھائی دِیا

●

قشقہء غم پسِ دیوار کہاں تک کھینچیں
ہم ترے لُطف کا آزار کہاں تک کھینچیں

بات ہر بار ترے ظرف پہ آ رُکتی ہے
ہم ترا طُرّۂ دستار کہاں تک کھینچیں

دھوپ خود اپنی تمازت بھی تو کھو سکتی ہے
دُھوپ میں سایۂ دیوار کہاں تک کھینچیں

اور بھی دیر لگا دیتی ہے سورج کی کِرن
تارِ شب ہجر کے بیمار کہاں تک کھینچیں

اب تو ہم چلتے نہیں ہیں یونہی بس رینگتے ہیں
ڈوبتی نبض کی رفتار کہاں تک کھینچیں

ہم سے ہو سکتی نہیں تیرے مناظر پہ گرفت
وُسعتِ دیدۂ بیدار کہاں تک کھینچیں

ترے اِصرار پہ رکھا تھا کہانی میں تجھے
اب ترا کھیل میں کردار کہاں تک کھینچیں

●

جو سرِ نگاہِ یقین تھا ، وہ غُبارِ راہ چھٹا نہیں
وہ جو سنگِ وہم تھا موڑ پر وہی راستے سے ہٹا نہیں

میں نِکل سکا نہیں آج تک، ترے موسموں کی گرفت سے
جسے اپنے آپ پہ زعم تھا ، رہِ ابتلا میں ڈٹا نہیں

یہ جو دوستی کے ہیں سلسلے ، یہ برائے نام ہیں چل رہے
مرے حال پر جو برس پڑے، کسی آنکھ میں وہ گھٹا نہیں

وہ جو شکل عام سی شکل تھی ، مُجھے یاد رہ گئی کس طرح
مرے حافظے میں ہے کس لئے، وہ جو نام میں نے رٹا نہیں

ترا نام میرے وجود میں ، مری دھڑکنوں سے جُڑا رہا
وہ جو رابطہ تھا ضعیف سا ، ترے کاٹنے سے کٹا نہیں

کسی مہربان کے ہاتھ نے مُجھے بار بار بچا لیا
کبھی برق گرنے سے رہ گئی ، کبھی آسمان پھٹا نہیں

تری مصلحت کی مُنڈیر پر مرا ایک اشک پڑا رہا
تُو نے ایک عمر گُزار دی ، مرا ایک لمحہ کٹا نہیں

زر ِ اعتراف ادا کیا ، مرے دل سے بوجھ اُتر گیا
میں ہوں اپنی ذات میں سرخرو ، مرا کوئ رتبہ گھٹا نہیں

مری آنکھ تیری تلاش میں ترے راستے میں پڑی رہی
کسی انتشار کے دور میں ، مرا دھیان تجھ سے ہٹا نہیں

●

زخم جب لہجے کی تلوار سے لگ جاتے ہیں
ہم اُلجھتے نہیں ، دیوار سے لگ جاتے ہیں

بعض اوقات تو گاہک نہیں ملتا کوئی
بعض اوقات تو بازار سے لگ جاتے ہیں

جب سرِ راہ زمانہ نہیں چلنے دیتا
ہم پلٹتے ہیں درِ یار سے لگ جاتے ہیں

جب دریچے کی ہواؤں میں ہنسی پھوٹتی ہے
دِل اُچھل کر ترِی دِیوار سے لگ جاتے ہیں

قصد جب کوچۂ جاناں کا کبھی کرتا ہوں
کیسے پہیے مری رفتار سے لگ جاتے ہیں

ایک ہو جاتے ہیں جب چاند ، تحیُّر اور تم
دیکھنے والوں کے انبار سے لگ جاتے ہیں

بجھنے لگتی ہیں کئی جلتے چراغوں کی لَویں
کتنے دھڑکے ترے اِنکار سے لگ جاتے ہیں

سایۂ ابر مری چھت پہ اتر آتا ہے
پیڑ کتنے ، ترے دیدار سے لگ جاتے ہیں

تیرے رُخسار کے رنگوں سے مہک پھوٹتی ہے
غنچے کِھل کر تری گُفتار سے لگ جاتے ہیں

پیچھے ہٹ جاتے ہیں جب آپ جھلک دِکھلا کر
پھر سے ہم کوششِ بیکار سے لگ جاتے ہیں

●

خبر نہیں کہ وہ اب کس ہوا میں رہتا ہے
یہ اِک فقِیر تو ارضِ خدا میں رہتا ہے

خدا گواہ مجھے بُھولتا نہیں وہ شخص
کبھی دُعا ، کبھی دستِ دُعا میں رہتا ہے

یہاں تو اور طرح کی ہوا چلی ہوئی ہے
جو مُبتلا بھی نہیں ، اِبتلا میں رہتا ہے

اُٹھا کے مار مرے مُنہ پہ مدّعا میرا
وہ عُذر کیا ہے جو ردِّ عطا میں رہتا ہے

مجھے کسی سے بھی کچھ مانگنا نہیں آتا
یہ کون مجھ میں ہے جو اِلتجا میں رہتا ہے

نہ جانے کرتا ہے کیسے گُریز آئینے سے
بذات خود جو ضیا ہے حَیا میں رہتا ہے

مری طرف کوئی اُنگلی کبھی نہیں اُٹھی
یہ خوف کیا ہے جو ذہنِ رسا میں رہتا ہے

نہ جانے کتنے مراحِل سے ہم گزرتے ہیں
اُسے تو جب بھی ملو اِک اَدا میں رہتا ہے

●

یہ نہیں ہے کہ تُمھیں یاد نہیں رَکھا ہے
ہاں ، دل خستہ کو آباد نہیں رَکھا ہے

یوں تو ہم مشورہ کرتے ہیں زمانے بھر سے
ہم نے لیکن کبھی اُستاد نہیں رَکھا ہے

کرنے دیتے ہیں کہاں دِل کو ہم اُس کی مَرضی
یہ پرَندہ ، کبھی آزاد نہیں رَکھا ہے

ٹُھیس ہلکی سی بھی لگ جائے تو رَو پڑتا ہوں
مُجھ میں دِل رکھا ہے فَولاد نہیں رَکھا ہے

خَاک کو رَکھا ہے اَعزاز سمجھ کر سَر پر
فخر میں شجرہَ اَجداد نہیں رکھا ہے

ایک ہی ضِد ہے ترے نام کی نسبت سے بضِد
دِل میں مَجموعہء اَضداد نہیں رکھا ہے

قَریہَ ضبط میں ہنسنے کی سہُولت بھی نہیں
دِل کو خُوش ہم نے ترَے بعد نہیں رَکھا ہے

ہم تو ہَر روز ہی پڑھتے ہیں دَرُودِ اَنور
کون سا دِن ہے جو مِیلاد نہیں رَکھا ہے

یُوں تو رکھتے ہیں اَعادے کی تمنا لیکن
زیرِ لَب نَغمۂ فریاد نہیں رَکھا ہے

پَایہء عَزم میں لَغزش نہیں آئی طاہرؔ
زیرِ پا رَخنۂ اُفتاد نہیں رَکھا ہے

●

کڑا پہرہ بٹھا دیتے ہیں نِگرانی میں رکھتے ہیں
محبت کرنے والے دِل کو حیرانی میں رکھتے ہیں

تقاضا کرنے والوں کا ہر اک دَستور الٹا ہے
وہ خود خشکی پہ رہتے ہیں ہمیں پانی میں رکھتے ہیں

متاعِ عجز ہوتی ہے نشانی دردمندوں کی
اسی خاطر ہم اپنا عجز پیشانی میں رکھتے ہیں

تمھیں کیسے بتائیں ہم کہ دل پر کیا گزرتی ہے
قدم ہم الٹے سیدھے کس پریشانی میں رکھتے ہیں

مجھے تو دوستوں نے امتحاں میں ڈال رکھا ہے
وہ ہر مُشکل اُٹھا کر میری آسانی میں رکھتے ہیں

وہ جن لوگوں کی دلجوئی کو ہم نے فرض جانا ہے
ہمارے دل پہ اپنا پاؤں نادانی میں رکھتے ہیں

مسلسل ہنسنے والوں سے تبسّم روٹھ جاتا ہے
یہ غم انسان کو اپنی نگہبانی میں رکھتے ہیں

نئی موجوں کے اُٹھنے سے تلاطُم اور بڑھتا ہے
کنارے باندھ کر دریا کو طغیانی میں رکھتے ہیں

سنبھلنے ہی نہیں دیتی نظر کو شعبدہ بازی
یہ جلوے عقل کو اِک حشر سامانی میں رکھتے ہیں

بلا کی سادگی ہوتی ہے طاہر! خوش جمالوں میں
حِجاب اندر بھی کچھ چیزوں کو عُریانی میں رکھتے ہیں

●

انبوہ سے گزرے ، کبھی انبار سے گزرے
ہم بھیڑ میں تنہائی کے آزار سے گزرے

ہر روز بدلتا ہے ترا رنگِ طبیعت
ہر روز کوئی کیا ترے معیار سے گزرے

کیا نام کما سکتے تھے ہم تیری گلی سے
ہم لوگ تو خود جُبّہ و دستار سے گزرے

دنیا میں پذیرائی ہمیں خاک ملے گی
اِقرار جہاں کرنا تھا ، انکار سے گزرے

مطلب ہی نہیں تھا ہمیں کچھ تیری دُکاں سے
سَو مرتبہ یوں تو ترے بازار سے گزرے

اِک خواب نگاہی نے ہمیں گھیر کے رکھا
ہم جب بھی ترے قریہء بیدار سے گزرے

میں دیکھ نہیں پایا اُنھیں غور سے طاہرؔ!
کچھ لوگ ہوا تھے ، بڑی رفتار سے گزرے

●

جس سے برگشتہ ہوائیں تھیں زمانے بھر کی
اُس کی جانب ہی نگاہیں تھیں زمانے بھر کی

میں تو اندھا تھا دِکھائی نہیں دیتا تھا مجھے
تیرے چہرے پہ تو آنکھیں تھیں زمانے بھر کی

میرا ہر رستہ ترے گھر کی طرف جاتا تھا
تیری راہوں میں تو راہیں تھیں زمانے بھر کی

میں نے سورج کو بھی دیکھا ہے ترے زیرِ نگیں
ترے سائے میں پناہیں تھیں زمانے بھر کی

میں کڑی دھوپ میں جلتا تھا ستاروں کی طرح
چاند اوروں کا تھا ، راتیں تھیں زمانے بھر کی

مجھ کو لب بستہ کٹہرے میں کھڑا رکھتے تھے
ہاتھ سے لمبی زبانیں تھیں زمانے بھر کی

اُس کے ہونٹوں پہ کوئی ذکر نہیں تھا میرا
اُس کی باتوں میں تو باتیں تھیں زمانے بھر کی

مجھ کو تو منہ نہ لگاتے تھے ترے شہر کے لوگ
تیرے حق ہی میں اذانیں تھیں زمانے بھر کی

سُکھ کا اِک سانس بھی مانگا تو گھٹن ہی پائی
اُس کی مٹھی میں ہوائیں تھیں زمانے بھر کی

●

جوانی ختم ہوتی جا رہی ہے
کہانی ختم ہوتی جا رہی ہے

ترے غم کی فراوانی کے صدقے
گِرانی ختم ہوتی جارہی ہے

میں اب رُکنے لگا ہوں چلتے چلتے
روانی ختم ہوتی جا رہی ہے

تری پہچان کھوتا جا رہا ہوں
نشانی ختم ہوتی جا رہی ہے

نئی صورت نظر آئے تو دیکھوں
پرانی ختم ہوتی جا رہی ہے

اور اب پڑھ لکھ کے ہوتی ہے محبت
زبانی ختم ہوتی جا رہی ہے

مجھے پھر سے کمر کسنا پڑے گی
کمانی ختم ہوتی جا رہی ہے

بہت ہی خوبصورت تھی یہ دُنیا
نمانی ختم ہوتی جا رہی ہے

●

سَوادِ ہجر میں سنّاٹا خامشی تک ہے
سکوتِ حبس ہواؤں کی گُدگُدی تک ہے

میں تم کو دیکھوں گا اور کِھلکِھلا کے ہنس دوں گا
مری تو ساری اُداسی تری خوشی تک ہے

بس اس سے آگے تو اک روشنی ہی روشنی ہے
یہ مختصر سا اندھیرا مری گلی تک ہے

پھر اُس کے بعد مرے قہقہے ہی قہقہے ہیں
یہ میری آنکھ میں آنسو تری ہنسی تک ہے

نظر کے کاندھے پہ ذمہ ہے شِست باندھنے کا
یہ انگلیوں کا دباؤ تو لَبلَبی تک ہے

وہ نابلد ہے جو واقف نہیں محبت سے
خبر کا جاننا آہٹ سے آگہی تک ہے

میں آسمان کے نیچے کہیں پڑا ہوا ہوں
مری رسائی ستاروں کی جھونپڑی تک ہے

یہ زَعمِ ذات عبادت کو منہ پہ مارتا ہے
کمالِ حسنِ اطاعت تو عاجزی تک ہے

یہ چاند روز کسی اور گھر اُترتا ہے
مرا اور اُس کا تعلق تو چاندنی تک ہے

پھر اُس کے بعد تو منصف کے اختیار میں ہے
ہمارا کام ، عدالت میں حاضری تک ہے

میں اپنی ذات سے باہَر نکل کے آیا ہوں
یہ میری تم سے ملاقات واپسی تک ہے

یہ اور بات کہ آنسو ٹپک پڑے کسی وقت
یہ ہجر آنکھ میں شبنم کی اِک نمی تک ہے

●

میں تو جلا بجھا ہوا اک آدمی تھا بس!
غربت میں اِک چراغ تلے روشنی تھا بس!

اُس نے حدیثِ دل کو ہوا میں اُڑا دیا
میں چٹکیوں میں مسلی ہوئی آگہی تھا بس!

وہ گُل مہک رہا تھا سرِ شاخسارِ چشم
مَیں خاک میں ملائی ہوئی تازگی تھا بس!

اُس کی نظر کا لمس بدن میں اُتر گیا
وہ اُس کا دیکھنا تو فقط سرسری تھا بس!

اُس کا خیالِ خوب مری کائنات تھا
میرے لیے وہ شخص مری شاعری تھا بس!

کوئی بھی اُس طرح کا مری آنکھ میں نہ تھا
اور دِل میں میرے جذبۂ وارفتگی تھا بس!

اب تو ہر ایک شے سے مرا جی اُچاٹ ہے
کل تک مرا نصاب تو زندہ دِلی تھا بس!

کل ہر نظر میں مَیں ہی فقط شہریار تھا
اور آج اُس کے شہر میں مَیں اجنبی تھا بس!

جی چاہتا تھا آپ کو میں دیکھتا چلوں
مقصد مرا! حضور مری حاضری تھا بس!

میری طرح سے کیسے اکیلے رہو گے تم
اور اُس سے یہ سوال مرا آخری تھا بس!

اِک قہقہہ تھا ، جو کبھی کُھل کر نہ لگ سکا
میں اپنے حالِ زار پر اُس کی ہنسی تھا بس!

●

ربط میں جب دراڑ پڑ جائے
نرم لہجہ اُکھڑ اُکھڑ جائے

شاخ سے جب گلاب جَھڑ جائے
باغ کا باغ ہی اُجڑ جائے

زَعم تو خیر زَعم ہوتا ہے
اور جب عاجزی اَکڑ جائے

پھر بَھرم دسترس کا کُھلتا ہے
ایک دھاگا ، اگر اُدَھڑ جائے

تب کہیں جا کے نقش بنتا ہے
آنکھ کی پُتلی جب سُکَڑ جائے

سرد سے سرد مہر آدمی بھی
لَمس کی آنچ سے نچُڑ جائے

عقل سر پیٹتی ہے رستے میں
جب جنوں راستہ پکڑ جائے

باتیں اغیار کی ہیں زہر آلود
یار کی خامشی بھی لڑ جائے

کون جانے کہاں گِرے جا کر
جب سِتارا فلک سے جھڑ جائے

●

عکسِ غرورِ حُسن سے ، ششدر نہیں ہوا
حیرت کدے میں آئنہ پتھر نہیں ہوا

رُک رُک کے رہ میں پوچھنا پڑتا ہے راستہ
رستہ خود اپنے گھر کا بھی اَزبر نہیں ہوا

تھاما نہیں ہے میں نے کبھی بزدلی کا ہاتھ
بے خوف تو ہوا ہوں میں ، خود سَر نہیں ہوا

کیسے کروں گا اُس کی ہوا سے مُکالمہ
مجھ سے تو اپنا سانس مُسخرّ نہیں ہوا

پتھر تھا ٹھوکروں میں مجھے رکھ دیا گیا
اِک جا پڑے پڑے میں مدَوّر نہیں ہوا

جُھک جُھک کے میں نے سجدے کئے ہیں زمین پر
بیٹھے بٹھائے یوں ہی قَدآور نہیں ہوا

حُسنِ طلب میں پھول تھے، پَھل دار پیڑ تھے
ہم پر کوئی بھی لُطف، نچھاور نہیں ہوا

نقشِ قدم کو راہنما مانتا ہوں میں
عمداً قدم بڑھا کے برابر نہیں ہوا

ہم سے تو منھ بگاڑ کے کرتا ہے وہ بھی بات
جو رُعب ڈالنے پہ مقرّر نہیں ہوا

●

قدم قدم پہ ارادوں کا رُخ بدلتے ہوئے
میں رو پڑا تھا ترے شہر سے نکلتے ہوئے

نشیب میں کوئی جیسے لڑھکتا جاتا ہے
کُچھ اس طرح سے گزرتی ہے عُمر ڈھلتے ہوئے

بس اس خیال سے ہی دل دَھڑکنے لگتا ہے
میں گر پڑوں نہ کہیں راستے میں چلتے ہوئے

محبتوں میں بہت کچھ لُٹانا پڑتا ہے
بہت سے پیڑ گراتے ہیں پھول، پھلتے ہوئے

پھر اُس کے بعد مجھے نیند ہی نہیں آئی
سِسک پڑا تھا پسِ شب چراغ جلتے ہوئے

مجھے تو لگتا ہے قدموں میں بُجھ رہا ہے کوئی
کسی نے دیکھا ہے کیا موم کو پگھلتے ہوئے

کوئی بھی ہاتھ نہ پہنچا مری مدد کے لیے
گزر گیا ہے وہ لمحہ مجھے کچلتے ہوئے

●

ہم سے جو کام نہیں ہوتا وہ کب کرتے ہیں
عِشق تو اِس لیے کرتے ہیں کہ سب کرتے ہیں

اَب کسی بات پہ ہم کرتے نہیں اپنا لحاظ
بات جب حد سے گُزر جاتی ہے، تب کرتے ہیں

ہم کو مدہوشی میں بھی حُسن کا رہتا ہے خیال
ہم سے دیوانے کہاں سوئے اَدب کرتے ہیں

بعض اوقات تو کچھ معجزے ہو جاتے ہیں
وہ جو کچھ ہاتھ نہیں کر پاتے ، وہ لب کرتے ہیں

تیری توَصِیف میں دن رات دھڑکتا ہے یہ دِل
اور ترے ذِکر کی تسبیح یہ لب کرتے ہیں

یہ جو رکھے ہوئے رہتے ہیں مری نَبض پہ ہاتھ
دِل کی رَفتار کا ہرجانہ طلب کرتے ہیں

کُوئے جاناں کا جو کرتے نظر آتے ہیں طَواف
یہ روایت ہے یہ اِک عُمر میں سب کرتے ہیں

ایک لحظے کو ہٹاتے نہیں چہرے سے نظر
تم کو معلوم ہے کیا جان بہ لب کرتے ہیں

تم کو رکھا ہے ہتھیلی پہ پَھپُھولے کی طرح
یہ تو ہم اپنی محبت کے سبب کرتے ہیں

●

توفیق ہے تو کچھ مرے کاسے میں ڈال دے
ورنہ تری رضا ہے ہوا میں اُچھال دے

تو آنے والے کل کی ضمانت نہ دے مجھے
بہتر یہی ہے وعدۂ فردا پہ ٹال دے

تیری طرح کا دوسرا کوئی نہیں ، مگر
میری طرح کا بھی کوئی ہے تو مِثال دے

میرے جواب سے تو اگر مطمئن نہیں
جو پوچھنا ہے پوچھ مجھے لا سوال دے

جو آج مجھ کو بیٹھنے دیتا نہیں کہیں
کل کیا عجب ہے شہر سے باہر نکال دے

اِک بار پھر سے لوگ مجھے چاہنے لگیں
اک بار پھر سے کوئی ہُنر دے ، کمال دے

تیری نوازشات کا میں ہوں جواب دہ
تُو بھی تو میرے گزرے ہوئے ماہ و سال دے

●

اَب صورتِ حالات سے پہلو نہیں بچتا
روتا ہوں ، تو پھر آنکھ میں آنسو نہیں بچتا

گر اُس کو لگا لیتا ہوں میں اپنے گلے سے
پھر اپنی حفاظت کو بھی بازو نہیں بچتا

ہیں کس کے لیے چاند ستارے تری آنکھیں!
کیوں میرے لیے ایک بھی جگنو نہیں بچتا

میں اپنی محبت کو اگر پلڑے میں رکھ دوں
ایمان تو بچتا ہے ، ترازو نہیں بچتا

سب پار اترتے ہیں یہاں پانی پہ چل کے
لکھی ہو تو خشکی پہ بھی تارُو نہیں بچتا

یہ کوچۂ حیرت ہے قدم پھونک کے رکھنا
سر چڑھ کے ، اگر بولے تو جادو نہیں بچتا

تحقیر کے لُقمے کو اگلنا ہی پڑے گا
گر حلق بچاتا ہوں تو تالو نہیں بچتا

انسان درندہ ہے درندوں سے زیادہ
جنگل میں چلا جائے تو آہو نہیں بچتا

میں اُس کے کسی حکم سے انکار کروں تو
وہ کان میں کہتا ہے کہ اب تو نہیں بچتا

●

بیچ بازار کے گٹھڑی نہیں کھولی جاتی
ہر ترازو میں تو خوشبو نہیں تولی جاتی

آپ کے کہنے سے پہلے ہی سمجھ جائے کوئی
یہ زباں وہ ہے جو سب سے نہیں بولی جاتی

اِک تبسّم کے عوض اُس نے خریدا ہے مجھے
تم بتاؤ کہ کہاں تک مری بولی جاتی

میری خواہش تھی معانی کی گرہ کھولتے آپ
کاش ہوتا کہ مری بات نہ تولی جاتی

پھر ترے ذکر کی تسبیح کے دانے بنتے
گرتے اشکوں میں ، اگر تار پرو لی جاتی

تم نے جب آنکھ کی پُتلی میں اُسے رکھنا تھا
یہ ضروری تھا کہ پھر آنکھ بھی دھولی جاتی

گر مرے علم میں ہوتا کہ خریدار ہیں آپ
اِک دُکاں آپ کے کوچے میں بھی کھولی جاتی

●

دل و جاں ہار کر بیٹھا ہوا ہوں
میں خود کو مار کر بیٹھا ہوا ہوں

جِدھر سے کُچھ دکھائی دے رہا تھا
اُدھر دیوار کر بیٹھا ہوا ہوں

پلٹنا اب مرا ممکن نہیں ہے
میں سرحد پار کر بیٹھا ہوا ہوں

بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے
میں خود پر وار کر بیٹھا ہوا ہوں

میں اُس غم کو سُلا پاؤں گا کیسے؟
جسے بیدار کر بیٹھا ہوا ہوں

جنوں نے بال بکھرائے ہوئے ہیں
گریباں تار کر بیٹھا ہوا ہوں

مرے آگے کہانی بولتی ہے
میں ہر کردار کر بیٹھا ہوا ہوں

ابھی تک روح کے اندر خلِش ہے
بدن سرشار کر بیٹھا ہوا ہوں

اب اُس کی بات کیسے مان لوں میں
جسے اِنکار کر بیٹھا ہوا ہوں

میں اُس کا منتظر ہوں راستے میں
سفر دُشوار کر بیٹھا ہوا ہوں

مرے اندر جو خوش فہمی تھی طاہر!
اُسے دُھتکار کر بیٹھا ہوا ہوں

●

گر ترے نام کا نہیں ہوں میں
پھر کسی کام کا نہیں ہوں میں

رات جانے کہاں گزاروں گا
گھر پہ تو شام کا نہیں ہوں میں

جس نے لینا ہے مُفت لے جائے
ورنہ نیلام کا نہیں ہوں میں

جل بجھوں گا کسی منڈیر پہ میں
طاق کا ، بام کا نہیں ہوں میں

بیٹھ جاتا ہوں ایک کونے میں
راہ کا ، گام کا نہیں ہوں میں

غم خوشی سے کشِید کرتا ہوں
ساقیا! جام کا نہیں ہوں میں

میں فقط دل کی بات سنتا ہوں
بندہ اَحکام کا نہیں ہوں میں

خود اکیلا سہوں گا ہجر کا دُکھ
کُشتہ کہرام کا نہیں ہوں میں

جُملہ احباب اجتناب کریں
اب کسی کام کا نہیں ہوں میں

مسکراہٹ پہ بکنے والا ہوں
دِرہم و دام کا نہیں ہوں میں

●

دِیا بُجھا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں
میں لَو لگا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

مری دُعا سے ہتھیلی چمکنے لگتی ہے
میں ہاتھ اُٹھا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

کوئی جو مُٹھی میں سُورج کو بھینچ لیتا ہے
میں مُسکرا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

کبھی جو چاند نکلنے میں دیر ہوتی ہے
نظر جما کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

ترے خیال کا جگنو چمکنے لگتا ہے
میں جگمگا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

مجھے دکھائی نہیں دیتے لوٹنے والے
میں لُٹ لُٹا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

مری نگاہ میں دریا چمکنے لگتا ہے
دِیا بہا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

میں جانتا ہوں اندھیرے کی حکمرانی ہے
میں سر جُھکا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

مرے قریب سے جب روشنی گزرتی ہے
میں لڑکھڑا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

کبھی جو روٹھا ہوا لمحہ ہاتھ آتا ہے
اُسے مَنا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

لگا رہا تو میں لَو بھی بنا ہی لوں گا سلیمؔ!
دِیا بنا کے اندھیرے میں بیٹھ جاتا ہوں

●

جان ، ہیجان سے نکل آئے
ناؤ طوفان سے نکل آئے

اُس کے چہرے پہ رنگ پھیل گئے
پھول گُلدان سے نکل آئے

اپنا دم سادھ کر تری صورت
چشمِ حیران سے نکل آئے

اب بھی کوئی نہ کوئی اُس کی چیز
میرے سامان سے نکل آئے

یہ بھی ممکن ہے اُس کا نقشِ پا
میرے دالان سے نکل آئے

اتنا سنّاٹا میری ذات میں تھا
جسم پر کان سے نکل آئے

بھول جاتا ہوں جس کو میں عمداً
وہ مرے دھیان سے نکل آئے

چھوڑ دی اُس نے جب سخن فہمی
ہم بھی اوزان سے نکل آئے

اُس نے تلوار توڑ ڈالی تو
ہم بھی میدان سے نکل آئے

●

اے لمسِ دستِ یار مرے ساتھ ساتھ چل
سُونی ہے رہ گزار مرے ساتھ ساتھ چل

منزل کا راستہ مرے قدموں کو یاد ہے
اے راہ کے غُبار مرے ساتھ ساتھ چل

کب مجھ کو سیرِ گلشنِ ہجراں کا شوق تھا
دل نے کہا کہ یار مرے ساتھ ساتھ چل

اے میرے شوق مجھ کو بھی ہمراہ لے کے چل
اے طفلِ بے قرار مرے ساتھ ساتھ چل

تیرے بغیر کیسے کٹے گا یہ راستہ
اے میرے اعتبار مرے ساتھ ساتھ چل

لحنِ سخن طراز کِھلانے لگا ہے پھول
اے موجۂ بہار مرے ساتھ ساتھ چل

●

کیا حال پوچھتا ہے زمانہ مزاج کا
اب تک وہی ہے رنگ پُرانا مزاج کا

میں سرنگوں ہوا تو وہ قدموں میں آ گرا
اِک بوجھ بن گیا تھا اُٹھانا مزاج کا

مجھ میں کسی کے رنگ مہکتے ہیں آج بھی
مجھ میں ہے ایک پیڑ پُرانا مزاج کا

رنجش ، خوشی ، گریز ، تکلّف ، نوازشات
اُس ایک شخص میں ہے گھرانا مزاج کا

کرتا ہے روز روز وہ وعدہ خلافیاں
گھڑتا ہے نِت نیا وہ بہانہ مزاج کا

معمول ہم بدلتے ہیں موسم کو دیکھ کر
چہرہ ہے ایک آئنہ خانہ مزاج کا

وہ حال جان لیتے ہیں آنکھوں میں جھانک کر
مشکل ہے دوستوں سے چھپانا مزاج کا

طاہر تکلّفات کا قائل نہیں ہوں میں
پیتا ہوں پانی ، کھاتا ہوں کھانا مزاج کا

●

کوئی دَلیل ، بہانہ ، کوئی جواز نہیں
اگر نماز کی نیّت نہیں نماز نہیں

ہوا کا لمس گزرتا ہے مجھ کو چُھوتے ہوئے
تمھارے ہاتھ سا اُس میں مگر گُداز نہیں

میں اِکتفا پہ مکمل یقین رکھتا ہوں
ترے سوا تو مرا کوئی امتیاز نہیں

مرے خدا ! میں ترے ہاتھ کا بنا ہوا ہوں
نیاز مند ہوں تیرا ، میں بے نیاز نہیں

وہ جب بھی چاہے تعلق کو توڑ دیتا ہے
کسی بھی بات کا اُس شخص کو لحاظ نہیں

اگر مری کوئی حجّت نہیں قبول تجھے
مری طرف سے کوئی عُذر ، اعتراض نہیں

جو پڑھنا چاہے،وہ پڑھ لے، کھلی کتاب ہوں میں
مری حیات میں سربستہ کوئی راز نہیں

وہ، جس کو لکھنا نہیں آتا وہ بھی لکھتا ہے
مرے قبیلے میں ناصر نہیں ، فَراز نہیں

ابھی تو میں نے کوئی شعر کہنا سیکھنا ہے
مری بغل میں کوئی زَعم کی بیاض نہیں

●

میں نے اُڑان کے لیے جب پَر اُٹھا لیا
خواہش نے ایک گھونسلے سے سَر اُٹھا لیا

شیشے کے گھر میں اُٹھ گئی لیلائے حسنِ عصر
مجنوں نے اپنے ہاتھ میں پتھر اُٹھا لیا

حیرت سے میری آنکھ کی پُتلی سکڑ گئی
پلکوں نے کیسے مہرِ منّور اُٹھا لیا

سب کہہ رہے تھے شہر سے ہجرت کا وقت ہے
میں نے بھی ایک پوٹلی میں گھر اُٹھا لیا

گِرنے نہیں دیا کبھی آنسو زمین پر
مُٹھی میں جب بھی چاہا سمندر اُٹھا لیا

پانی سمجھ کے پی رہا تھا میں شراب کو
کمبخت ایک ہاتھ نے ساغر اٹھا لیا

پائے غُرور تھا کہ زمیں پھاڑنے کو تھا
ٹھوکر لگی تو آسماں سَر پر اُٹھا لیا

●

منظر کو جو دیکھیں تہ و بالا نظر آئے
اوپر سے سمندر بھی پیالہ نظر آئے

اُس کو بھی لگا لیتے ہیں ہم اپنے گلے سے
تیرا جو کوئی چاہنے والا نظر آئے

کچھ صورتِ حالات بھی واضح نہیں ہوتی
کچھ آنکھ کی پُتلی میں بھی جالا نظر آئے

کر دیتے ہیں ہر بات کو دشمن نظرانداز
اپنوں کو سفیدی میں بھی کالا نظر آئے

میں اپنی کوئی بات کبھی کر نہیں سکتا
جب تک نہ مجھے تیرا حوالہ نظر آئے

اِک عمر سے غفلت کے اندھیروں میں پڑا ہوں
وہ پردہ جو سرکائے اُجالا نظر آئے

شاید تمھیں اک آنکھ نہ بھائے مرا محبوب
مجھ کو تو وہ دنیا سے نرالا نظر آئے

●

اندھیرے کی کوئی گُنجلک، بُجھارت ہو تو کھولوں
مری مٹھی میں جگنو ہے ،اجازت ہو تو کھولوں

ہواؤں کے لیے میں نے کبھی کھڑکی نہ کھولی
تری آنکھوں کے موسم کی شرارت ہو تو کھولوں

قسم سے بند کر رکھی ہیں میں نے اپنی آنکھیں
اگر تم کو کوئی زَعمِ بصارت ہو تو کھولوں

بڑی مدّت سے خالی ہے یہ پُرکھوں کی حویلی
مرے دل میں اگر قَصدِ اقامت ہو تو کھولوں

تُمھیں کُھلنے نہیں دیتی ہے مجھ سے بدگُمانی
مرے حق میں ، اگر حسنِ رعایت ہو تو کھولوں

●

بہت دنوں سے کئی رَنگ اِضطراب میں ہیں
جو تم نے پھول دیے تھے، مری کتاب میں ہیں

بس ایک خواہشِ دیدار ہی اثاثہ ہے
ہزار عُذر ترے حلقۂ حجاب میں ہیں

میں ساکنانِ گزشتہ سے رابطے میں ہوں
مہاجرین دِلِ خانماں خراب میں ہیں

بس ایک ایڑ لگانے کی دیر باقی ہے
لگام ہاتھ میں ، پاؤں مرے رَکاب میں ہیں

ذرا سی دیر میں کھولوں گا اپنا کھاتا میں
مُغالطے ابھی کتنے ترے حساب میں ہیں

بہت سے چہروں کو پہچانتا نہیں ہوں میں
بہت سے چاہنے والے ابھی نقاب میں ہیں

یہ کون روز نیا آفتاب بھیجتا ہے
یہ کس کے چرچے محبت کے ماہتاب میں ہیں

ابھی خِرد کی کئی گُتھیاں سُلجھنا ہیں
سوال کتنے ہی تَشنہ ترے جواب میں ہیں

ہوا لیے لِیے پھرتی ہے اُس کی مہکاریں
بلا کی نکہتیں طاہرؔ مرے گلاب میں ہیں

●

قریۂ ہجر سے ہم صبح سے پہلے نکلے
بھاگتے بھاگتے سورج سے بھی آگے نکلے

رات بھر چاند نے اک کھڑکی کو روشن رکھا
اُس نے منہ پھیرا تو آنکھوں سے سِتارے نکلے

پھر مرا ظرف کسی ضبط کے قابل نہ رہا
درد کے ہونٹوں سے بے ساختہ نعرے نکلے

وہ مرے ہاتھ میں رہ کر تو نہیں ٹُوٹا تھا
کیوں مرے ہاتھ سے پھر کانچ کے ٹکڑے نکلے

آج اک راہ سے گُزرا تو بہت رنج ہوا
تھک کے بیٹھا تو کئی درد پرانے نکلے

بے گنہ تشنہ لبوں کی بڑی تحقیر ہوئی
موسمِ سرد میں ماتھے سے پسینے نکلے

نیند سے جاگا ہوا شخص بہت ہوش میں تھا
اُس کی آنکھوں سے کئی گزرے زمانے نکلے

کیسا منظر تھا کہ پل بھر میں بجھا تھا سورج
میں نے خود دیکھا تھا دوپہر میں تارے نکلے

ایک بس ہم سے تعلق ہی نبھایا نہ گیا
یوں تو ہر چیز کو رکھنے کے قرینے نکلے

●

جب پائے ِ نارسائی نے وَحشت کو چُھو لیا
منزل نے آگے بڑھ کے مسافت کو چُھو لیا

موسم کُھلا ، تو میں نے تمنّا کی شاخ پر
کِھلتے ہوئے گُلاب کی رَنگت کو چُھو لیا

آنکھیں گُھما کے اُس نے جو دیکھا مری طرف
میری نظر نے اَدھ کُھلی حیرت کو چُھو لیا

سرما کی دھوپ سے مری آغوش بھر گئی
ٹِھٹھرَے بدن نے قُرب کی حِدّت کو چُھو لیا

مجھ کو انا کے پہلو میں لینا پڑی پناہ
جب اُس نے جان بوجھ کے غفلت کو چُھو لیا

دُنیا سے میں نے ہاتھ جَھٹک کر چھڑا لیا
اور خُوش دِلی سے دَستِ قناعت کو چُھو لیا

تاریک آنکھ دن کے اجالے سے بھر گئی
پلکوں نے جب سے دستِ عقیدت کو چُھو لیا

سورج کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا میں
خُنکی بڑھی تو میں نے تمَازت کو چُھو لیا

جھونکا ہوا کا حَبس کے پہلو سے آ لگا
خُوش لمس نے فَسُردہ طبیعت کو چُھو لیا

بارش کی ایک بُوند شَرابور کر گئی
بادل کو گھر بُلا کے مُصیبت کو چُھو لیا

پھر چاند مسکرا کے مرے ساتھ چل پڑا
پھر میں نے آسمان کی وُسعت کو چُھو لیا

●

دل تو کہتا ہے اِسی قریۂ پامال میں رہ
یار جِس حال میں رکھتا ہے، اُسی حال میں رہ

وہ تجھے آنکھ کی پُتلی سے گِرا سکتا ہے
تجھ سے یہ کس نے کہا تھا کسی بھونچال میں رہ

اِتنی نخوت سے زمیں پر نہیں چلتا کوئی
چلتے رہنا ہے تو پھر عجز کی ٹکسال میں رہ

اے مری جان کے دُشمن! تو گریزاں کیوں ہے
تُو مرا جُرم ہے! تو نامۂ اعمال میں رہ

سبز کونپل ہے، اگر تُو، تو کسی شاخ پہ پُھوٹ
تو جو لاوا ہے تو جا کر کسی پاتال میں رہ

جب کوئی قید کی حالت میں دعا مانگتا ہے
خود بہ خود بنتی چلی جاتی ہے، پھر جال میں رہ

●

دامنِ عجز ندامت سے بھرے بیٹھے ہیں
تری دہلیز پہ ہم کھوٹے کھرے بیٹھے ہیں

جو عداوت میں تری آگے تھے، نزدیک ہوئے
جو حمایت میں ہراول تھے، پرے بیٹھے ہیں

تجھ سے نیکی کی توقع تو نہیں ہے، پھر بھی
دستِ اُمیّد کو ہم دِل پہ دھرے بیٹھے ہیں

ہم کو معلوم نہیں ردِّعمل کیسا ہو!
ہم کو مت چھیڑ کہ ہم لوگ بھرے بیٹھے ہیں

ہم سے بے وجہ الجھنے کی حماقت مَت کر
ہم تو خود اپنی طبیعت سے ڈرے بیٹھے ہیں

تیرے لہجے میں جو ٹھنڈک ہے، ہمیں جانتے ہیں
تیری آغوش کی گرمی میں ٹھرے بیٹھے ہیں

تو اگر ہاتھ پکڑ لے گا تو جی اُٹھیں گے
ورنہ یوں سمجھو کہ ہم لوگ مرے بیٹھے ہیں

حوصلے چھین لیے وقت کی گردِش نے سلیمؔ!
بازی کیا کھیلیں کہ ہم لوگ ہرے بیٹھے ہیں

●

یہ جو جرأت مرے اظہار میں رکھی ہوئی ہے
اس نے ہستی مری پیکار میں رکھی ہوئی ہے

جو بھی ملتا ہے بغاوت پہ اُتر آتا ہے
کچھ کجی شہر کی دیوار میں رکھی ہوئی ہے

تم کبھی دام لگاتے ہوئے اُس کو دیکھو
اِک رعُونت سی خریدار میں رکھی ہوئی ہے

خود بخود کھنچتا چلا جاتا ہوں اُس کی جانب
اک کشِش جان کے آزار میں رکھی ہوئی ہے

کچھ تکلُّف بھی ضروری ہے دکھاوے کے لیے
نیند بھی دیدۂ بیدار میں رکھی ہوئی ہے

اے مری جان کے مالک مری جانب بھی نظر
مری عرضی تری سرکار میں رکھی ہوئی ہے

سر پہ سورج ہو تو سائے کی دعا مانگتے ہیں
یہ محبت ہے ، جو اشجار میں رکھی ہوئی ہے

میں نے تو جو بھی توقع تھی ، اُٹھا کر رکھ دی
اِک طلب آپ کے انکار میں رکھی ہوئی ہے

کیا عجب ہے کہ یہی صبح کی سُرخی بن جائے
جو خبر شام کے اخبار میں رکھی ہوئی ہے

اُس کی کوشش ہے قفس کو بھی اڑا لے جائے
سَرکشی تیرے گرفتار میں رکھی ہوئی ہے

اب شناسا بھی گزرتا ہے گُریزاں مجھ سے
کوئی وحشت مرے آثار میں رکھی ہوئی ہے

مرے شانوں پہ تنی رہتی ہے گردن میری
اور مری عاجزی دستار میں رکھی ہوئی ہے

بند کمرے میں بھی ہوتا ہوں تو لگتا ہے سلیمؔ!
اُس نے کھڑکی مری دِیوار میں رکھی ہوئی ہے

●

ہدف بناتے ہیں ہم کو ، نشان کرتے ہیں
یہ کون لوگ تمھیں بدگُمان کرتے ہیں

سجانا پڑتا ہے اک چہرہ اپنے چہرے پر
ہم اک دکان کے باہر دکان کرتے ہیں

ہم ایسے لوگوں کا نعم البدل نہیں ہوتا
جو دَرد پالتے ہیں اور جوان کرتے ہیں

ہمارے دُکھ کی گواہی ہیں نم زدہ آنکھیں
وہ اور لوگ ہیں جو خود بیان کرتے ہیں

دُعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو مینھ برستا ہے
مری زمیں پہ کرم آسمان کرتے ہیں

نظر کے سامنے ہوتے ہیں حادثات کئی
ہم اِک سڑک کے کنارے دکان کرتے ہیں

ہم اپنی مرضی سے کھاتے ہیں دھوکا اَوروں سے
ہم اپنے ہوش میں ہیں اور دھیان کرتے ہیں

جواز ہوتا نہیں ہے جہاں اُلجھنے کا
ہم عُذر کھینچتے ہیں درمیان کرتے ہیں

ترے سلوک سے اُمید بہتری کی ہے
ہم ایسا چاہتے ہیں اور گمان کرتے ہیں

شکستہ پر ہیں منڈیروں پہ بیٹھے رہتے ہیں
ہم ایسے لوگ کہاں ، کب اڑان کرتے ہیں

●

اِس دِل کو ترے ناز اُٹھانے کی پڑی ہے
تو ہے کہ تجھے سارے زمانے کی پڑی ہے

وہ میرے قریب آنے سے ہر بار گریزاں
مجھ کو بھی فقط ایک بہانے کی پڑی ہے

چلتا ہوں جو رہ پر تو توَازُن نہیں رہتا
اے شوق تجھے دوڑ لگانے کی پڑی ہے

یہ آپ کے رخسار پہ چھوٹا سا جو تِل ہے
چہرے پہ یہی چیز ٹھکانے کی پڑی ہے

ڈرتا ہوں وہ مجھ سے کہیں ناراض نہ ہو جائے
ہر وقت مجھے اُس کو منانے کی پڑی ہے

اے نشّہء غم سر سے اُتر کیوں نہیں جاتا
تجھ کو تو مجھے صِرف گرانے کی پڑی ہے

دل اُس سے ملاقات سے کم پر نہیں راضی
قاتل سے اسے ہاتھ مِلانے کی پڑی ہے

اُس حسنِ دلآویز کو فرصت نہیں ملتی
ہر وقت اُسے آئینہ خانے کی پڑی ہے

تم مل کے بھی مجھ سے کسی اُلجھن میں پڑے ہو
کیا مجھ سے کوئی بات چھپانے کی پڑی ہے

کیا راز ہے جو تم سے چھپایا نہیں جاتا
کیا بات ہے جو تم کو بتانے کی پڑی ہے

●

شاخ دَر شاخ ٹھکانے کو بدلتا ہوا میں
موسمِ خشک کا پرَوَرْدَہ پرَندہ ہوا میں

تیری خوابیدہ نِگاہیں مرے کِس کام کی ہیں
بھاگتا پھِرتا ہوں خوابوں سے بَھگایا ہوا میں

اِک ہرا پیڑ ہوں ، موسم کی محبت کے طفیل
شُکر کرتا ہوں اَدا پُھولتا ، پَھلتا ہوا میں

لوگ اب تیرے حوالے سے مجھے جانتے ہیں
ورنہ اِس شہر میں پِھرتا تھا بھٹکتا ہوا میں

کوئی نَفرت سے جو دیکھے تو بَھڑک اُٹھتا ہوں
راکھ ہو جاتا ہوں اَندر سے سُلگتا ہوا میں

اب جو نِکلا ہُوں تو مُشکل ہے پَلٹنا میرا
اَپنے ہی گھر سے زَبردستی نِکالا ہوا میں

اَب تو رَستے کا تعیُّن بھی نہیں کر پاتا
اَپنے ہی پیروں پہ کُچھ اِتنا گُھمایا ہوا میں

اُس کا کہنا ہے تری آنکھ نہ ہنسنے پائے
اچھا لگتا ہوں اُسے پھُوٹ کے روتا ہوا میں

جب کوئی آنکھ مرا چہرہ نہ پڑھنے پائے
دُور ہو جاتا ہوں مَنظر سے نکلتا ہوا میں

●

کس کی حیا کے رَنگ مہکتے ہیں باغ میں
اِک اور بھی سُراغ ہے پِنہاں سُراغ میں

خُوش فَہم تھا ، جو آپ کی باتوں میں آ گیا
کُچھ دن ہوا بھری رہی میرے دماغ میں

دو گھونٹ روشنی کے اندھیرے میں کیا پیئے
اَب تک اُبل رہی ہے سیاہی اَیاغ میں

اِک دِن کیا تھا لَو نے ہَوا سے مُکالمہ
اُس دِن سے خُون جلتا ہے میرا چَراغ میں

رَنگ اُڑ رہے ہیں نقل مَکانی کے شَوق میں
خُوشبو بھٹک رہی ہے ہَوا کے سُراغ میں

مُجھ کو تُمھاری فِکر سے فُرصَت نہیں ملی
گرچہ پڑا ہوا ہوں میں کُنجِ فراغ میں

سوچو! تو نیشِ عشق سے سینہ فگار ہے
دیکھو! تو کتنے داغ ہیں لاَلے کے دَاغ میں

سُنتا ہوں خامشی کی بھی میں گفتگو سلیم!
بیٹھا ہوا ہوں قَریۂ نَہجُ البَلاغ میں

●

پلک جھپکنے سے پہلے ارادہ کرتا ہے
جو شخص ہم سے محبت زیادہ کرتا ہے

وہ راز ہے اُسے کُھلنے میں دیر لگتی ہے
وہ گُنجلک ہے ، مگر بات سادہ کرتا ہے

وہ کھیلتا ہے مرے دل سے اعتماد کے ساتھ
بڑے یقین سے اِک اور وعدہ کرتا ہے

کسی کی نرمی کا میں فائدہ اُٹھاتا نہیں
مجھ ایسا شخص کہاں اِستفادہ کرتا ہے

وہ جس کو ہاتھ ہلا کر گزر کے جانا تھا
وہ میری آنکھ پہ دَستک زیادہ کرتا ہے

اُس ایک شخص سے طاہر میں ڈرتا رہتا ہوں
جو دِل بساط سے بڑھ کر کُشادہ کرتا ہے

●

اِک دُوسرے سے مختلف سب کے بیان ہیں
یہ لوگ کون لوگ ہیں جو بدگُماں ہیں

مرہم سبھی کے زخم پہ رکھا نہیں گیا
اب بھی کٹے پھٹے ہوئے کچھ خاندان ہیں

دُشمن تو میرے روزِ ازل سے خلاف تھے
لیکن جو میرے دوست ہیں کیوں بدگُماں ہیں

ہم کو تمھاری دُھوپ میں چلنا پسند ہے
رستے میں کچھ پڑاؤ ہیں ، کچھ سائبان ہیں

میرا گُماں عجز کی اِک جھونپڑی میں ہے
جِس کے جلو میں کتنے ہی پختہ مکان ہیں

کرتی نہیں ہے کوئی دَقیقہ فروگُزاشت
دیوارِ حسنِ یار کی آنکھیں ہیں ، کان ہیں

●

سَر میں سَودا بھی ہے اور خاک بھی ڈالی ہوئی ہے
دونوں ہاتھوں سے یہ دَستار سنبھالی ہوئی ہے

وہ جو اِک جاہ کی خواہش تھی ، اُسے ترک کیا
خاکساروں میں جگہ ہم نے بنالی ہوئی ہے

آنکھ والوں کو دِکھائی نہیں دیتا کُچھ بھی
ایسا لگتا ہے کہ ہر آنکھ نکالی ہوئی ہے

رنگ بھر بھر کے لیے پھِرتی ہے قَریہ قَریہ
اِک ہوا نے میری مَہکار چُرا لی ہوئی ہے

کون کہتا ہے کہ جِینا نہیں آتا ہم کو
زندگی شہرِ خرابات میں گالی ہوئی ہے

ہم نے پھولوں کے علاقے میں قدم رکھنا ہے
وادیِ خار سے اِک راہ نکالی ہوئی ہے

ہم نہیں جانتے اب کون وہاں رہتا ہے
ہم نے اُس در سے توقّع ہی اُٹھالی ہوئی ہے

چشم بے مہر کے صدقے نہیں جاتے طاہرؔ
عشق کی جیب عِنایات سے خالی ہوئی ہے

●

جو چُپ تھا بَولنے لگا تھوڑی سی احتیاط
باتوں کو تَولنے لگا تھوڑی سی احتیاط

اُس سے کہو کہ درد کی ترسیل روک دے
غم زہر گھولنے لگا تھوڑی سی احتیاط

کُھلتی نہیں ہے ہاتھ کی باندھی ہوئی گِرہ
دانتوں سے کھولنے لگا تھوڑی سی احتیاط

اِتنا ہی بوجھ ڈال میں جِتنا اُٹھا سکوں
اب جسم ڈولنے لگا تھوڑی سی احتیاط

ہاتھوں سے گِر کے ٹُوٹنے والا تھا آئِنہ
اِک عکس بولنے لگا تھوڑی سی احتیاط

ڈَرتا ہوں حاسدوں کی نظرتاک میں نہ ہو
دھڑکا ٹٹُولنے لگا تھوڑی سی احتیاط

کرنا پڑے گا صبر کو مُجھ سے مُکالمہ
دُکھ منھ سے بولنے لگا تھوڑی سی احتیاط

باندھا ہے جس نے ضبط کی زَنجیر سے ہمیں
اب ہاتھ کھولنے لگا تھوڑی سی احتیاط

جو درد دل میں تھا مرے بے سُدھ پڑا ہوا
رگ رگ ٹٹولنے لگا تھوڑی سی احتیاط

اُس اَشکِ بَدنہاد سے ممکن نہیں گُریز
آنکھیں پَھرولنے لگا تھوڑی سی احتیاط

●

بڑی مدّت سے ہونٹوں پر مرے اک حرفِ سادہ ہے
کبھی تم بھی تو بتلا دو ، تمھارا کیا ارادہ ہے

ہمیں اک دوسرے سے ضد جدا ہونے نہیں دیتی
مُجھے اُس سے محبت ہے اُسے نفرت زیادہ ہے

مجھے کوئی ضرورت ہاتھ پھیلانے نہیں دیتی
مرے تَن پر ہمیشہ سے قناعت کا لِبادہ ہے

تری تقسیم کے آداب نے حیران کر ڈالا
ترے حِصّے میں پُورا ہے مرے حصے میں آدھا ہے

تمھاری حاکمیّت کے سِوائے کچھ نہیں ہو گا
مری مُٹھی میں آجاؤ ، مری مُٹھی کُشادہ ہے

ہمیں اِک دوسرے سے عاجزی نے باندھ رکھا ہے
محبت کرنے والوں کا الگ اِک خانوادہ ہے

کسی نے میرے سارے پیڑ طاہر کاٹ ڈالے ہیں
مری یادوں میں خوشبو ہے ، نگاہوں میں بُرادہ ہے

●

شَاخِ شیریں پہ تلخ پھل آیا
اَشک اِک آنکھ سے نِکل آیا

کون لکھے گا رَوشنائی سے
میں سیاہی بَدن پہ مَل آیا

یاد رکھا ہے کس نے پَت جھڑ میں
خُشک پھولوں کا پارسل آیا

خود بہ خود چہرے بے نَقاب ہوئے
مَیں فقط آئنے بَدل آیا

چلتے چلتے زمین ختم ہوئی
کھارے پانی سے پہلے تھل آیا

میں نے رکھی تھی سطحِ آب پہ آنکھ
عکس کو دیکھنے کَنول آیا

میں ابھی سُن رہا تھا خاموشی
آپ کی بات سے خلل آیا

●

شَاخ سے جب گلاب ٹوٹتا ہے
خوشبوؤں پر عذاب ٹوٹتا ہے

جوڑنے سے بھی پھر نہیں جُڑتا
دِل جو خانہ خراب ٹوٹتا ہے

پھر ہوا سے ہوا نہیں مِلتی
جب ہدف پر عُقاب ٹوٹتا ہے

اُس سے پُوچھو کہ کیا گزرتی ہے
جس کے سَر پر عتاب ٹوٹتا ہے

چاندنی بھی تو ٹوٹتی ہو گی
جب کوئی ماہتاب ٹوٹتا ہے

حُسن اور عِشق کی کَشاکَش میں
خود بخود ہی نقاب ٹوٹتا ہے

یوں بھی ہوتا ہے مے کی تَلخی سے
زعمِ جامِ شراب ٹوٹتا ہے

اَبرِ رحمت سے پیاس بُجھتی ہے
بارِشوں سے سَراب ٹوٹتا ہے

لَوٹ کر نِیند کیوں نہیں آتی
جب بھی افسونِ خواب ٹوٹتا ہے

●

جب تک سیاہ تِل ترے رُخسار پر رہے
رَوشن چراغ شام کی دِیوار پر رہے

پھر بعد میں یقین کی حَد پار ہو گئی
اَور اِبتدا میں وَسوَسے اِنکار پر رہے

ہم نے طلب میں کوئی اضافہ نہیں کیا
جو اُس نے بخش دی اُسی مِقدار پر رہے

شانوں سے اپنے سر کو اُترنے نہیں دیا
دَھبّے ، اگرچہ سیکڑوں دَستار پر رہے

اَب یاد آ رہا ہے تو اِک پل نہیں قرار
اللہ کا کرم دِلِ بیمار پر رہے

جو آنکھ تاَک میں تھی ، اُسے اُونگھ آ گئی
اِلزام سارے دِیدۂ بیدار پر رہے

واں جِس جگہ پہ بولنے کی کوئی جا نہ ہو
بہتر ہے خَامُشی لَبِ اِظہار پر رہے

مَیں خود بھی چاہتا ہوں کہ اب اُس کی مان لوں
یہ کیا کہ مُستقِل کوئی اِنکار پر رہے

یہ کس طرح کا خوف مُسلّط کیا گیا
یہ کیا کہ دھیان ہر گھڑی تلوار پر رہے

تم ہی کہو کہ دیکھتی آنکھوں کا کیا کروں
قدَغن ، اگر اِسی طرح دِیدار پر رہے

●

یقین بُھول چکا ہے پسِ گُماں رکھ کر
تُو اپنے تیر تو گِن ہاتھ سے کماں رکھ کر

میں شعر کہتے ہوئے خوشبوؤں سے کھیلتا ہوں
میں پُھول چُنتا ہوں کاغذ پہ تِتلیاں رکھ کر

مجھے بدن نہیں چھونے دیا کسی نے کبھی
کِتاب پڑھتے ہیں حرفوں پہ اُنگلیاں رکھ کر

تجھے کچھ اس کے سوائے بھی چاہیے، تو بتا
ہتھیلی میں نے بڑھا دی ہے اپنی جاں رکھ کر

میں اپنے آپ سے باہر نِکل نہیں پایا
تجھے بھی دیکھ لیا میں نے درمیاں رکھ کر

میں اُس کی نظروں سے چہرہ چُھپا نہیں پاتا
وہ دیکھ لیتا ہے آنکھوں پہ اُنگلیاں رکھ کر

●

بے جا نوازشات کا تخمینہ بن چکا
اب ذِکرِ یار قصّہٗ پارینا بن چکا

اب تو تمھاری چنداں ضرورت نہیں رہی
یہ دل تمھارے عکس کا آئینہ بن چکا

پہچان کر بھی وہ مجھے پہچانتا نہیں
مِیرے معاملات میں نابینا بن چکا

اُس کے بغیر زندگی بے لُطف ہو گئی
اُس کے بغیر جِینا بھی مرجِینا بن چکا

ہر وقت جس کے حال سے رہتی تھی آگہی
زندہ تعلّقات کا مَدفِینہ بن چکا

وہ شخص خُود ہی دِل سے اُترتا چلا گیا
جس جا پہ داخلہ تھا، وہاں زِینہ بن چکا

کوشش کے باوجود بھی لگتی نہیں ہے تان
جو سُر گلے میں تھا مرے، سازِینہ بن چکا

کی ہے لہو نے دِل کے جزِیرے میں توڑ پھوڑ
ساحل کٹا پَھٹا سا مرا سِینہ بن چکا

پہنا ہے اِتنی مرتبہ کَھدّر کو جِسم پر
وہ اس قدر گِھسا ہے کہ پَشمِینہ بن چکا

●

قریۂ ضبط میں ہے ، سوچ کی تحویل میں ہے
یہ جو اِک دل ہے ترے حکم کی تعمیل میں ہے

میں تو خود اپنی مدد پر نہیں قُدرت رکھتا
مجھ میں وہ بات نہیں ہے ، جو اَبابیل میں ہے

میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں کا مَنشا اِک ہے
میری ہر بات کنایے ، تری تفصِیل میں ہے

اُن کے نعلین کے صدقے میں بسر ہوتی ہے
جن کے آنے کی بِشارت تری اِنجیل میں ہے

قطرہ ، قطرہ جو مری پلکوں پہ شبنم اُترے
میں سمجھتا ہوں کہ رحمت تری ترسِیل میں ہے

کب ترے قُرب کی حِدّت اِسے پگھلائے گی
زَعم کی برف ابھی عرصۂ تحلِیل میں ہے

میں تو مٹی کا دیا ہوں مری لَو ہے مدّھم
روشنی تم کو جو درکار ہے، قندیل میں ہے

شعر کہنے کی مشقت میں لگا رہتا ہوں
میرے ہر مصرعے کی ہیئت ابھی تشکِیل میں ہے

●

یوں تو کوئی بھی کام مؤخر نہیں کیا
تیری طرح سے دل کبھی پتّھر نہیں کیا

جَھڑنے لگی وُجود کی اینٹوں سے خستگی
دیوارِ جاں کو میں نے پلستر نہیں کیا

یکجا نہ ہو سکیں کبھی دامن کی دھجیاں
تُو نے رفُو کا کام رفُوگر نہیں کیا

پھر میں نے خُوش دِلی سے خسارہ اُٹھا لیا
اُس شخص سے حِساب برابر نہیں کیا

سمجھا ہے اَوک ہی کو غنیمت تمام عُمر
پیالا کسی دباؤ میں سَاغَر نہیں کیا

بچپن کا ایک نام مجھے اب بھی یاد ہے
کیسے کہوں کہ کچھ کبھی ازبر نہیں کیا

●

کرچیاں تَعلُّق کی عُمر بھر اٹھاتے ہیں
ایک توڑ دیتے ہیں ، دُوسرا بناتے ہیں

ہم بھی کتنے ناداں ہیں ، دردِ دِل سمجھتے ہیں
اَور دِل کے زخموں کو آنکھ سے چُھپاتے ہیں

آپ کی شرائط پر کام کرنا مشکل ہے
آپ تو مزاج اپنا ہر جگہ دکھاتے ہیں

ٹُوٹ ٹُوٹ جاتے ہیں سُرخ کانچ کے پیکَر
اَور پِھر خمیر اَپنا خَاک سے اُٹھاتے ہیں

آنسوؤں کی بارش میں بِھیگنا ضروری ہے
وَرنہ یاد کے موسم عمر بَھر رُلاتے ہیں

سوچ کی جَسارَت کو رَوکنا ہی پڑتا ہے
ذہن کی فراغت کو کام پر لگاتے ہیں

دُوسروں کی باتوں کا اب تو دُکھ نہیں ہوتا
ہاتھ سے لکھی باتیں ، ہاتھ سے مِٹاتے ہیں

رَات کے اندھیرے میں دِن نکلنا مُشکل ہے
رَات کو سِتارے ہی راستہ بتاتے ہیں

●

ایک دن اُس نے مری آنکھ میں آنکھیں رکھ دیں
دُھوپ میں جیسے بَرَستی ہوئی بوندیں رکھ دیں

رات بھر اُس کے تصوّر میں مجھے نیند نہ آئی
میں نے پھر پیشِ نظر خواب سی باتیں رکھ دیں

آتے جاتے ہوئے ہر شخص کو وہ دیکھتا تھا
پیڑ نے راہ کی دِیوار پہ شاخیں رکھ دیں

پھر میں اُس شہر کی گلیوں سے لِپٹ کر رویا
جِس نے وَا کر کے مرے رَستے میں باہیں رکھ دیں

اَب تو ہم دیکھتے رہتے ہیں تمھارا چہرہ
جب سے دیکھا تمھیں ہاتھوں سے کتابیں رکھ دیں

وہ کوئی ہاتھ تھا یا تُند ہوا کا جھونکا
جِس نے جھنجھوڑ کے خیمے کی طَنابیں رکھ دیں

میں بلندی سے گِروں گا تو بچوں گا کیسے؟
کاٹ کر کِس نے مرے اُونٹ کی کونچیں رکھ دیں!

صبح تک درد نے آغوش میں رکھا مُجھ کو
خواب نے ٹُوٹ کے آنکھوں میں سَلاخیں رکھ دیں

عُمر بھر کِس نے مرے چین کو تاراج کیا
کِس نے مُٹھّی میں جکڑ کر مری سانسیں رکھ دیں

بازگَشت اُس کی ابھی تک مرے مَاحول میں ہے
جس کی یادوں نے پَلٹ کر مری جَہتیں رکھ دیں

●

بکھر گئے ہیں بہت بال و پَر پرندوں کے
دِکھائی دیتے نہیں اب تو گھر پرندوں کے

اُڑان کے لیے بس حوصلہ ضروری ہے
پھر آسمانوں سے لگتے ہیں سَر پرندوں کے

وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے اَسیر ہو کے رہیں
کُترتے رہتے ہیں کچھ لوگ پَر پرندوں کے

بہت سے سانپ درختوں پہ چڑھنا جانتے ہیں
لہُو میں دوڑتے رہتے ہیں ڈَر پرندوں کے

شِکاری روز نیا جال پھینک دیتے ہیں
لبوں پہ قصّے ہیں کچھ بے خبر پرندوں کے

کئی تو اُڑنے سے پہلے ہی پکڑے جاتے ہیں
کہیں پہ رہتے ہیں جاری سَفر پرندوں کے

ہر ایک اُڑنے کو اِک آسمان مانگتا ہے
اڑیں تو کُھلتے ہیں کچھ اور پَر پرندوں کے

جو ابتدا ہی میں گِر جائیں گھونسلوں سے سلیم
وہ بچے ہوتے ہیں پھر دَر بہ دَر پرندوں کے

●

چاند ہوتا ، کوئی سورج کہ ستارہ کوئی
کاش ہوتا سرِ افلاک ہمارا کوئی

اپنی آنکھیں میں ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہوں
ایسا کرتا ہے فقط ہجر کا مارا کوئی

خُود بہ خُود بھیگنے لگتی ہیں ہماری آنکھیں
خود بہ خود ٹوٹنے لگتا ہے کِنارہ کوئی

پوچھتا پھرتا ہوں ہر ایک سے میں اپنا پتا
بات سنتا نہ سمجھتا ہے اشارہ کوئی

وہ جو یک جان نہیں ہوتے بکھر جاتے ہیں
پھر سمٹتا ہی نہیں اُن سے کھلارا کوئی

مجھ کو جو آنکھ دکھاتی ہے وہی دیکھتا ہوں
اپنی مرضی سے نہیں کرتا نظارہ کوئی

ہجر میں بات بنانے کا ہنر آتا ہے
وصل میں ہوتا نہیں مصرع کرارا کوئی

●

کبھی کُرید کے دیکھا کہ کیا نکلتا ہے
کٹا ، پھَٹا ہوا ہر رَابطہ نکلتا ہے

کوئی بتائے کہ کیسے گُریز ممکِن ہے
قدم قدم پہ ترا نقشِ پا نکلتا ہے

محبتوں کے سفر میں کہیں پڑاؤ نہیں
یہ راستہ ہے بہت دُور جا نکلتا ہے

تری بھنک بھی اگر کَان میں کہیں پڑ جائے
بگُولا دوش پہ رکھ کر ہوا نکلتا ہے

امیرِ شہر جہاں کان بند رکھتا ہو
وہاں مدد کے لیے خود خُدا نکلتا ہے

ابھی تک اُس کی منڈیروں پہ دُھوپ اُگتی ہے
ابھی بھی چاند ، دَریچے میں آ نکلتا ہے

وہ اور تھے یدِ بیضا نکال لیتے تھے
میری بغل سے تو دستِ دُعا نکلتا ہے

●

وہ کیا تھا ، کیا نہیں تھا ، دماغ اب نہیں رہا
خوشبو کا ایک باغ تھا ، باغ اب نہیں رہا

کاندھے سے میرے اُس نے بھروسہ اٹھا لیا
دَاغا جو پُشت پر تھا ، وہ دَاغ اب نہیں رہا

اِک چلچِلاتی دُھوپ نے رَنگت بِگاڑ دی
خوشبو کے ہاتھ میں بھی سُراغ اب نہیں رہا

اپنے لیے بھی گھر سے نکلتے نہیں ہیں ہم
بیکار زندگی میں فَراغ اب نہیں رہا

اب جس قدر نصیب ہے پیتے ہیں اوک سے
پیاسوں کی دَسترس میں اَیاغ اب نہیں رہا

کب آگئی لگام اندھیرے کے ہاتھ میں
بس اِتنا جانتا ہوں چِراغ اب نہیں رہا

یہ شہر ، شہرِ یار تھا ، پھولوں کا ایک شہر
اُڑتی ہوئی مہک کا سُراغ اب نہیں رہا

●

میں کیا کروں بتاؤ دلِ خوش گُمان کا
اِک اجنبی کو دے دیا ، قبضہ مکان کا

جب سے وہ کھیلنے لگا غیروں کے ہاتھ میں
لہجہ بدل گیا ہے مرے مہربان کا

دیکھا ہے اُس کی سمت نگاہوں نے بَار بَار
آنکھوں میں عکس بن گیا اک آسمان کا

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جب اُس نے بات کی
مجھ کو یقین آ گیا اُس کے بَیان کا

جب سے وہ گفتگو کا دَریچہ نہیں کُھلا
کانوں میں شور بھر گیا سارے جہان کا

شہرِ سخن میں مجھ کو عقِیدت ہے میرؔ سے
اَدنیٰ نیازمند ہوں اُردو زَبان کا

●

کچھ اِس لیے بھی تباہی کا میں شِکار ہوا
کہ مُجھ پہ حملہ محبت کا بار بار ہوا

مرے علاوہ نہیں تھا کسی کی جیب میں کُچھ
میں بِھیک مانگنے نکلا تو شرمسار ہوا

بَساطِ صبر سے باہر مکالمہ کرلیں
معاہدے میں ، اگر کوئی بے قرار ہوا

مری نظر سے نہیں ہٹتے خَال و خَد اُس کے
میں سوچتا ہوں وہ چہرہ اگر غُبار ہوا

جو گاہے گاہے مجھے یاد آتا رہتا ہے
اگر کبھی وہ میرے ذہن پر سَوار ہوا

یہ کِس کے اَشک تری آنکھ رو رہی ہے سلیمؔ!
یہ کِس کا دُکھ ترے چہرے سے آشکار ہوا

●

ششدر طلسمِ آئنہ خانہ پڑا ہوا
دیکھا ہے اُن کے دَر پہ زمانہ پڑا ہوا

مہتاب ماند تھا رُخِ انور کے سامنے
لگتا تھا اِک چراغ پُرانہ پڑا ہوا

رَد کر دِیے رسول نے سُورج بھی چاند بھی
ٹُھکرا دیا ہر ایک خزانہ پڑا ہوا

گِرتی ہے آسمان سے رَحمت کی بُوند بُوند
پھر پُھوٹتا ہے خاک میں دَانہ پڑا ہوا

اُن کا وجود غایتِ تخلیقِ کائنات
رودادِ ہجر میں ہے فسانہ پڑا ہوا

پردے گِرا دِیے گئے آنکھوں پہ، عقل پہ
اور غارِ ثور میں تھا خزانہ پڑا ہوا

حکمت چڑھی پہاڑ پر لے کر رسول کو
اب تک خجِل ہے پیچھے زمانہ پڑا ہوا

صدیق نے سُراقہؓ سے ہجرت میں سچ کہا
ورنہ تو نِت نیا تھا بہانہ پڑا ہوا

پڑھتی ہے رَس کو چوس کے مکھی درُودِ پاک
بنتا ہے شہد تب یہ خزانہ پڑا ہوا

●

مدّت سے مری آنکھ میں پانی بھی نہیں ہے
رونے کے لیے کوئی کہانی بھی نہیں ہے

دروازے پہ دستک دیے جاتا ہے بڑھاپا
اور کمرے میں بچپن بھی جوانی بھی نہیں ہے

کس طرح سے ڈھونڈوں گا تجھے بھیڑ میں کھو کر
تیری تو مرے پاس نشانی بھی نہیں ہے

برتن لیے پانی کا میں کیوں بھاگ رہا ہوں
جب میں نے کوئی آگ بجھانی بھی نہیں ہے

کل تک وہ مرے پاس یہیں بیٹھا ہوا تھا
یہ بات کوئی اتنی پُرانی بھی نہیں ہے

بستر پہ پڑا خواب ابھی جاگ رہا ہے
اب نیند مرے کمرے میں آنی بھی نہیں ہے

لہجے نے ہر اک راز اُگل دینا ہے طاہرؔ
آنکھوں نے کوئی بات چُھپانی بھی نہیں ہے

●

کوئی تو ہے جو انھیں دَانہ دُنکا ڈالتا ہے
یہ اِتنے سارے پَرندوں کو کون پالتا ہے

بچھایا جاتا ہے اِک آسمان اُس کے لیے
کوئی پرندہ اگر بال و پَر نکالتا ہے

وہ اپنے بندوں میں بھرتا ہے گُوندھ گُوندھ کے عجز
پھر اپنی مرضی کے سانچوں میں اُن کو ڈھالتا ہے

وہ بخشتا ہے حرارت ، تو پُھوٹتا ہے بیج
وہ چاہتا ہے تو پھر پودا سر نکالتا ہے

مری زمین مجھے اپنی سمت کھینچتی ہے
ہَوا میں جب کوئی اُوپر مجھے اُچھالتا ہے

گدائی بخش دے مولا دَرِ محمدؐ کی
ترَا فقیر خزانوں پہ خاک ڈالتا ہے

●

سودا سفر کا تھا کبھی ، اب سر میں کچھ نہ تھا
خشبوئے رفتگاں کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا

پھیلی ہوئی ہتھیلی پہ رکھی تھی عاجزی
اور اختیارِ دستِ تونگر میں کچھ نہ تھا

پھر سارا کام پاؤں کی لغزش نے کر دیا
ٹھوکر لگی ،تو کانچ کے پیکر میں کچھ نہ تھا

سب کچھ تھا میری ذات کے اندر پڑا ہوا
دیکھا تو میری آنکھ کے منظر میں کچھ نہ تھا

جب اُس نے دِل پہ ہاتھ دھرا تو دھڑک اُٹھا
ورنہ مجھ ایسے راہ کے پتھر میں کچھ نہ تھا

اک چپ لگی ہوئی تھی رَوِش کی زبان کو
دہلیز پر پڑے ہوئے پتھر میں کچھ نہ تھا

پھر اُس نے پیار سے مرا کشکول بھر دیا
وہ شخص جس کے اپنے مُقدّر میں کچھ نہ تھا

●

کب میں پھرتا تھا یوں اُداس اُداس
اے محبت! تمھارا ستیاناس

ایک اک کرکے یار چُھوٹ گئے
کتنا بنتا تھا میں مزاج شناس

ایک پتھر سے تھی شَناسائی
باندھ کے پھر رہا ہوں تَن پہ کپاس

تیرے ہونٹوں سے بھی نہیں بُجھنی
میرے اندر بچھی ہے پیاس ہی پیاس

ایک کونے میں بیٹھ جاتا ہوں
مجھ کو تنہائی آگئی ہے راس

ہر قدم لڑکھڑا رہا ہوں میں
میرے ہمراہ چل رہا ہے ہراس

اب تو خود پر بھی میں نہیں کُڑھتا
اب نکلتی نہیں ہے دِل کی بھڑاس

●

مقتل میں فقط عابدِ بیمار بچے تھے
اِک قصۂ پُردرد کے کردار بچے تھے

بیعت کا تقاضا تھا ، تقاضے پہ تقاضا
اِک عزمِ مصمّم بچا ، اِنکار بچے تھے

جلتے ہوئے خیموں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا
یا گردشِ دوراں کے گرفتار بچے تھے

اُس شام کی آنکھوں میں شفق پھیل گئی تھی
اِک پھول کے مسلے ہوئے رُخسار بچے تھے

بالوں میں اتر آئی جوانی ہی میں پیری
جو اشک بچے آنکھ میں گُلنار بچے تھے

حُجّت کو امامت نے چراغ آپ بجھایا
خیمے میں شہادت کے خریدار بچے تھے

وہ صبحِ خطابَت تو وَراثت میں ملی تھی
یَلغار سے کب شام کے دَربار بچے تھے

●

وَاہمہ جب کوئی وجدان میں آ جاتا ہے
سایہ چلتا ہوا دَالان میں آ جاتا ہے

مطمئن رہتا ہے دل ذاتی خسارے میں مرا
نَفع ملتا ہے تو نُقصان میں آ جاتا ہے

روک لیتا ہے مجھے میرے ہی جیسا کوئی
غور کرتا ہوں تو پہچان میں آ جاتا ہے

اِک تجلّیِ مرے پہلو میں اُتر آتی ہے
نقش اِک دِیدۂ حیران میں آ جاتا ہے

اُس کی یادوں سے مہک اُٹھتا ہے کمرہ میرا
لمس اُس کا مرے سامان میں آ جاتا ہے

تجھ کو اُمید بھری آنکھ سے جب دیکھتا ہوں
اک تیقُّن مرے ایمان میں آ جاتا ہے

سر جھٹکتا ہوں کئی بار ، مگر تیرا خیال
پھر پَلٹ کر دِلِ وِیران میں آ جاتا ہے

ٹوٹ کر مجھ میں ہی گرتے ہیں کنارے میرے
ایک دریا ہے ، جو طُوفان میں آ جاتا ہے

●

آنکھ اب چپ نہیں رہتی مری رونے والی
مجھ سے اب اَور محبت نہیں ہونے والی

اُس کی پوروں سے سُنا ہے کہ لہُو رِستا ہے
وہ جو لڑکی تھی یہاں پھول پرونے والی

ایک بے ساختہ موسم نے شرابور کیا
ایک بوچھاڑ تھی بارش کی بھگونے والی

آتے جاتے ہوئے لوگوں پہ نظر پڑتی رہے
مجھ کو کُرسی کوئی دینا یہاں کونے والی

اُس کی اِک آنکھ مرے ہجر میں رو پڑتی ہے
اُس کی اِک آنکھ کی فطرت ہے کھلونے والی

اب تو جو بوجھ پڑا ہو، وہ پڑا رہتا ہے
اب تو اعصاب میں ہمّت نہیں ڈھونے والی

ایک بچہ اُسے چپ چاپ کھڑا دیکھتا تھا
ایک تصویر تھی بچے کی کھلونے والی

●

اِک شبنمی پھوار نے موسم بدل دِیا
یاد آ کے ، یادِ یار نے موسم بدل دِیا

سانسیں پڑی ہوئ تھیں گُھٹن کی گرِفت میں
اِک موجۂ بہار نے موسم بدل دِیا

زندہ دِلی نے غم کو ہوا میں اُڑا دِیا
ہنس ہنس کے غمگُسار نے موسم بدل دیا

پُھولوں سے لد گئیں مری سوچوں کی ڈالیاں
خوشبوئے برگ و بار نے موسم بدل دِیا

اِک خوش نظر نے روح میں ٹھنڈک اُتار دی
اِک چشمِ اعتبار نے موسم بدل دِیا

آنکھوں کے خُشک قریئے بھی آباد ہو گئے
اشکوں کی اِک قطار نے موسم بدل دِیا

قد آوری مِلی تو میں سجدے میں گر گیا
حد درجہ اِنکسار نے موسم بدل دیا

جو ذہن پر دباؤ تھا کافُور ہو گیا
خوش لَمس دستِ یار نے موسم بدل دیا

جگنو سرِشت شخص نے روشن کیا مُجھے
اک برف کے شرار نے موسم بدل دیا

●

روشن قدم قدم پہ مدینے کی راہ ہے
دُنیا تجلّیات کی آماجگاہ ہے

جس دِن ترا نہ ذکر کرے نُطقِ کم نَسب
وہ دِن مری حیات کا یومِ سیاہ ہے

اونچا ہے جس جگہ پہ فقیروں کا مرتبہ
روئے زمیں پہ ایک تری بارگاہ ہے

رکھنا سروں پہ ہاتھ غریبوں کے بادشاہ
یہ عاجزوں کی فوج ہے تیری سِپاہ ہے

تیرے شعورِ سبز سے شاداب ہے جہاں
سیراب تیرے خُلق سے برگ و گیاہ ہے

عقل و خرد ہیں خیر کے منصب پہ سرفراز
اُسؐ کی گلی میں عجز کے سر پر کلاہ ہے

اُسؐ کی گلی میں سارے کماں دار ہیچ ہیں
وہ ایک بادشہ ہے ، جو عالم پناہ ہے

وہ اپنی ذات میں یک و تنہا و منفرِد
اور اِس سے آگے سوچنا حدِّ گُناہ ہے

●

باندی تھی خادمہ تھی امامت ، حُسینؑ کی
دراصل معجزہ ہے شہادت حُسینؑ کی

درکار تھی یزید کو بیعت حُسینؑ کی
وہ جانتا تھا قدر اور قیمت حُسینؑ کی

کر سکتے تھے وہ جان کا سودا یزید سے
پر جان سے بھی مہنگی تھی بیعت حُسینؑ کی

نام و نِشاں یزید کا باقی نہیں رہا
لیکن رواں دواں ہے ولائیت حُسینؑ کی

وقفہ تھا زعم ِذات کا دورِ یزیدیت
اب حشر تک چلے گی قیادت حُسینؑ کی

اُس کے لہو پہ نارِ جہنّم حرام ہے
جس دِل میں موجزن ہے محبت حُسینؑ کی

نیزے پہ سر بلند ہوا سَر حُسینؑ کا
دُنیا میں گُونجتی ہے تِلاوت حُسینؑ کی

پھر دفعتاً چراغ کو اُس نے بُجھا دِیا
غُربت میں خیمہ زن تھی بصارت حُسینؑ کی

طاہرؔ کِسے نصیب ہے سجدہ حُسینؑ کا
آپ اپنی ہے مثال عِبادت حُسینؑ کی

●

مِدحت سے مہک اُٹھتے تھے گُلزارِ مدینہ
مکّے سے نظر آتے تھے آثارِ مدینہ

چلتا ہے تو پھر پیچھے پلٹ کر نہیں تکتا
اُڑتا ہی چلا جاتا ہے رہوارِ مدینہ

خود اپنے کمالات سے مَسحُور ہے ہجرت
اِک مرکزی کِردار ہے ، کِردارِ مدینہ

انصار ہوئے کیسی سعادت سے سرافراز
کونین کا سردار ہے سردارِ مدینہ

دُنیا میں مَثیل اُن کا کوئی اور نہیں ہے
دُنیا میں نَظرِ اپنی ہیں انصارِ مدینہ

زائر کو عطا کرتے ہیں خود اِذنِ حضوری
مہمانوں سے خود ملتے ہیں سرکارِ مدینہ

دُنیا میں علاج اس کا کہیں اور نہیں ہے
رہتا ہے مدینے میں ہی بیمارِ مدینہ

جو چاہے خریدو یہاں طاعَت کے عِوض تُم
دِن رات کُھلا رہتا ہے ، بازارِ مدینہ

مکّے سے نِکلنا پڑا کس حالِ زَبُوں میں
داخل ہوئے کس شان سے سالارِ مدینہ

●

جسم ہے چاند میں اور روح ستارے میں ہے
عصرِ حاضر کی قسم جان خسارے میں ہے

یہ مرا دِل مرے ہاتھوں سے نِکل جاتا ہے
ایسا لگتا ہے کہ گُوندھا ہوا پارے میں ہے

یہ مری آنکھ کسی سمت ٹھہرتی ہی نہیں
یہ ترا حُسن ہے یا پینگ ہلارے میں ہے

جو گُزرتا ہے ، مری خاک اُڑا دیتا ہے
ایسا کیا عجز مری مِٹّی میں گارے میں ہے

یہ جو اِک لمس کی لذّت ہے مری پور میں ہے
یہ جو اک درد ہے یہ جسم میں سارے میں ہے

ایک مدت سے مری آنکھ جھروکے میں ہے
کیا کوئی حُکم مری ذات کے بارے میں ہے

یہ زمیں زاد ہواؤں میں نظر آتا ہے
یہ ہوا ہے کہ کوئی چیز غُبارے میں ہے

●

یہ جو ایک دستِ سوال ہے ترے سامنے
کوئی غم سے کتنا نڈھال ہے ترے سامنے

میں پڑا ہوں قریۂ ہجر کے اُسی کُنج
میں مگر ایک شہرِ وصال ہے ترے سامنے

یہاں عرضِ حال پہ کس کو اِتنا عبور ہے
یہاں کس کی اتنی مجال ہے تری سامنے

مرے آئینے ، مری عاجزی سے کلام کر
ترا ایک واقفِ حال ہے ترے سامنے

میں دیا جلا کے مُنڈیر پر نہیں رکھ سکا
تو ہوا ہے جلنا محال ہے ترے سامنے

یہ جو وقت ہے یہ نہیں کسی کی گرِفت میں
ترا حُسن رو بہ زوال ہے ترے سامنے

ترے اختیار کی تیغ ہے ترے ہاتھ میں
مری عاجزی مری ڈھال ہے ترے سامنے

مجھے بات سے بات نکالنے کا ہُنر ملا
یہی مجھ میں ایک کمال ہے ترے سامنے

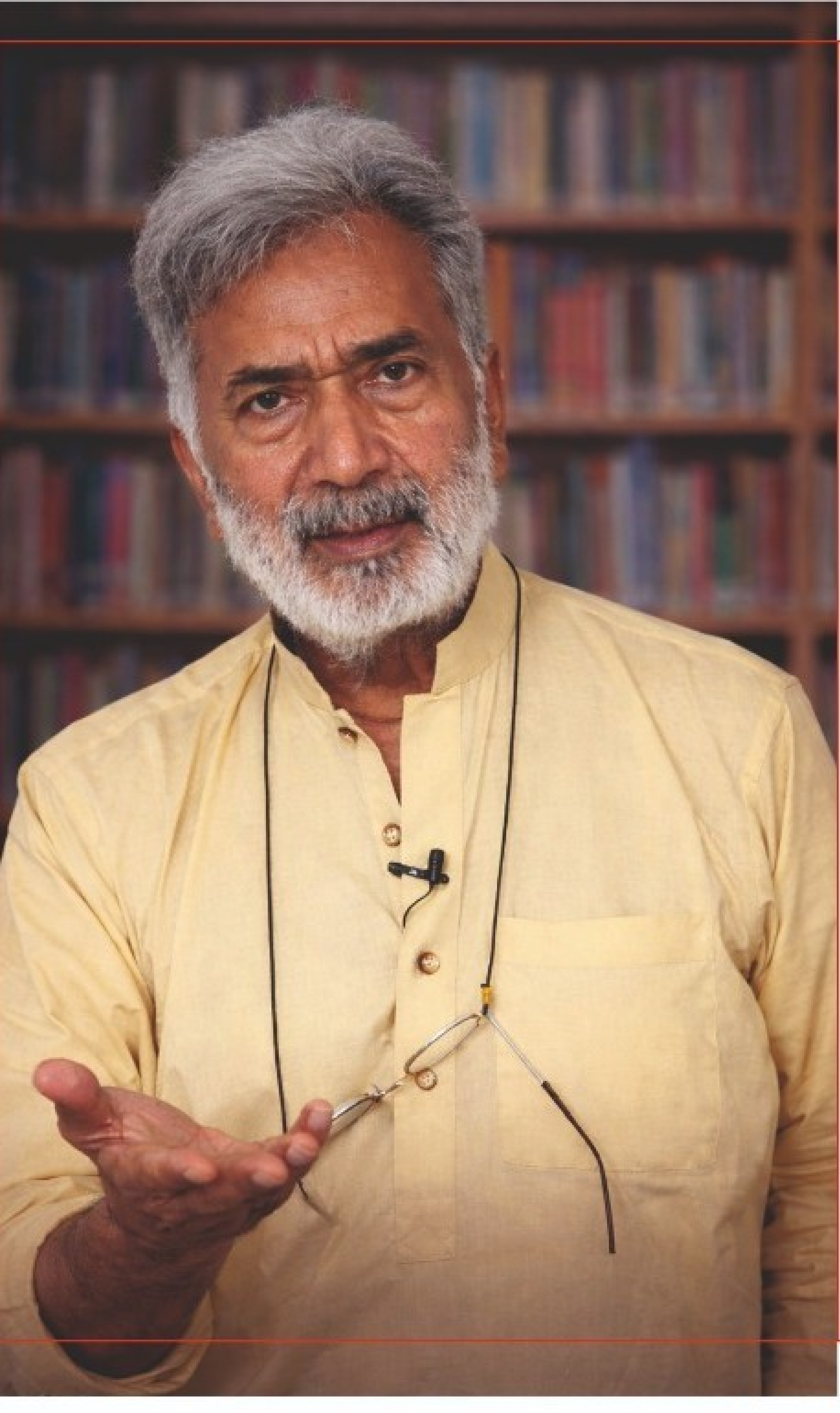

محمد سلیم طاہر نہ صرف اُردو اور پنجابی کے ممتاز لکھنے والے ہیں بل کہ پاکستان ٹیلی وژن کے منفرد براڈ کاسٹر بھی رہے ہیں۔ تاہم ان کی انفرادیت پی ٹی وی کے حوالے سے کہیں زیادہ ایک تازہ کار شاعر کی حیثیت سے ہے۔ وہ پنجابی اور اُردو میں یکساں سہولت سے شعر کہتے ہیں۔ پیشِ نظر مجموعہ ان کی تازہ کاری اور مضمون آفرینی کے ضمن میں ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے زیرِ نظر مجموعے میں چند اہم امتیازات قافیوں اور ردیفوں کی ندرت، ترکیبوں کی تازہ کاری، زبان کے روایتی اور روزمرہ استعمال سے ہٹ کر بات کرنے کا میلان، برجستگی اور بے ساختہ پن اور تلازماتی نظام کا دروبست قابلِ توصیف ہیں محمد سلیم طاہر لفظ کو سلیقے سے نبھانے اور اس کے ساتھ بے تکلفی برتنے کا ہُنر جانتے ہیں۔ اس مجموعے میں ردیفوں کی غیر معمولی انفرادیت، نیز لمبی ردیفوں کے استعمال میں قدرتِ کلام کا اظہار قابلِ داد ہے یاد رکھنا چاہیے کہ ردیف، قافیے کی تابع مہمل نہیں ہوتی۔ یہ دراصل معانی کے ڈلیے کا اُبٹن ہے۔ میرے محدود مطالعے کے مطابق حال کے کسی اُردو شعری مجموعے میں ردیفوں کی ایسی کثیر ندرت دیکھنے میں نہیں آئی۔ علاوہ ازیں اس مجموعے کے پُرزور مطلعے بے ساختہ قاری کو کلماتِ توصیف کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر ایک جُملے میں محمد سلیم طاہر کی شاعری کے اسلوب کو بیان کرنا چاہیں تو وہ ہے اظہار کی نادرہ کاری ایسی نادرہ کاری جو معاصر اُردو شاعری میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

ڈاکٹر تحسین فراقی

سلیم طاہر کی غزل مکالماتی چراغ کی لو سے پھوٹتی ہے۔ مکالمہ جہاں امکانات کا در باز کرتا ہے، وہاں دوستی اور محبت کی راہ بھی ہموار کرتا ہے اور اس نے یقیناً غزل سے دوستی اور تعلقِ خاطر کا راستہ بنا لیا ہے اور اس کا یہ مکالمہ ذات سے ورائے ذات تک پھیلا ہوا ہے۔ سلیم طاہر نے غزل کو نیم وحشی اظہار کا وسیلہ بنانے کے بجائے تہذیب سے آراستہ کر لیا ہے۔ اس نے واردات، مشاہدات اور تجربات کو باہم آمیخت کر کے غزل کا خمیر گوندھا ہے اور یہی ہنر معاصر شاعری میں اس کا امتیاز ٹھہر گیا ہے۔ اس کی غزل ”کہرام“ سے ”ماتمِ یک شہرِ آرزو“ تک آتے آتے اپنا مکالماتی نظام وضع کر چکی ہے، جسے بجا طور پر سلیم طاہر کا شعری اسلوب بھی قرار دیا جاسکتا ہے اور وہ اس ہنر کاری میں معاصر شعرا سے الگ ہی نہیں ممتاز بھی نظر آتا ہے۔ سلیم طاہر کی غزل کا ناک نقشہ اور مہاندرا بالکل اسی پر گیا ہے، یعنی اس کی تخلیق میں کسی دوسرے کی شباہت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ جس طرح اپنی زندگی میں سیدھا سادہ اور کھرا انسان ہے، اسی طرح اپنے اظہار میں بھی واضح اور سچا نظر آتا ہے۔ وہ بات کرنا جانتا ہے، یعنی اسے شعر کہنے کا فن آتا ہے۔ وہ غزل میں ادھر ادھر بھٹکتا نہیں ہے، اس کی فکر میں ایک تسلسل ہے، اس کے تخیل میں ایک وضاحت ہے اور اس کے اظہار میں ایک فصاحت ہے جو معنویت کی روشنی سے مزین ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس نے لفظ کو زبان آشنا کیا ہے، شعر کو گویائی دی ہے، تو یہ ہرگز غلط نہ ہوگا۔ ہمارا معاشرہ زوال آمادہ ہے، ہمارا عہد مصلحت، منافرت اور مصالحت کا شکار ہے۔ ٹوٹتی روایات، مدھم پڑتی اقدار اور گروہی ادب کے معاشرتی تضادات میں سلیم طاہر کا دم غنیمت ہے اور اس کی غزل کا زرِ خالص اپنے قاری کو پوری سچائی کے ساتھ دعوتِ مکالمت دے رہا ہے۔

اشرف جاوید